

## فرحتِ اشتیاق

# کریا تھیں ستر لائے تھیں

## مکمل ناول

اماں کے انتقال کو سترہ روز ہو چکے تھے اور ان سترہ دنوں میں وہ اتنا رو چکی تھی کہ اب تو اسے ایسا لگتا تھا کہ شاید وہ زندگی میں دوبارہ کبھی رو ہی نہیں سکے گی۔ آنکھیں بالکل خشک اور ویران۔ چہرہ پرسوں کا بیمار اور زرد، وہ خود سے مکمل غافل ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دنیا میں اب جینا بڑا ہی فضول اور بے کار سا کام ہے۔ کیوں روز صبح ہو جاتی ہے۔ یہ قیامت آخر آ کیوں نہیں جاتی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا، کسی روز صبح آنکھ کھلے تو پتا چلے ساری دنیا تہہ و بالا ہو چکی ہے اور وہ

دن آگیا ہے جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے اور اماں کے مشترکہ کمرے میں بستر پر لیٹی ایک ٹک چھت کو گھورتے ہوئے خالی الذہنی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اتنے دنوں میں مکے والوں نے اس کا بے حد خیال رکھا تھا۔ کھانا کسی کے گھر سے آرہا ہے تو چائے کسی کے گھر سے۔ کبھی کوئی اس کا دل بہلانے کو اس کے پاس آکر بیٹھ جاتا کبھی کوئی۔ اس نفسا نفسی کے دور میں اہل محلہ کی یہ اپنائیت اور خلوص شاید اماں کی بے غرض چاہتوں کا جواب تھا۔ اماں جن کا مسلک محبت تھا، وہ اپنے پرانے سب کے لیے گھنی چھاؤں کی مانند تھیں۔ ان کا خیر محبت، خلوص اور رواداری سے اٹھایا گیا تھا۔ شاید ہی وجہ تھی کہ ان کے مرنے پر اپنے تو اپنے غیروں نے بھی اشک برسائے تھے۔ ہر آنکھ ان کی دائمی جدائی کے دکھ پر اشک بار تھی۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر حسن اندر آیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اتنے دنوں میں وہ پہلی بار اس کے پاس آیا تھا۔ فاطمہ نے اس کی طرف غور سے دیکھا تو وہ بہت تھکا ہوا اور نڈھال سالگا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر وہ اس کے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ جو اپنے خیال سے تمام آنسو بہا چکی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اس کے رونے کی شدت میں بتدریج اضافہ ہوا تھا اور وہ چپ چاپ سامنے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ نہیں وہ کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔ حسن اس کے





لیے پانی لے آیا اور دھیرے سے اسے مخاطب کیا۔  
”پانی پی لو۔“

اس نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور دھندلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی اس کی آنکھوں میں ہلکی سی بھی نمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر وہ ایک سی سانس میں پورا گلاس خالی کر گئی اس نے گلاس اس کے ہاتھ سے واپس لے لیا اور دوبارہ اس کے سامنے کرسی پر بٹھ گیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ سامنے بیٹھ کر نظریں جمائے کویا ہوا۔

”مانا کہ یہ دکھ بہت بڑا ہے۔ مگر ہمیں اسے برداشت کرنا پڑے گا۔ فاطمہ! خود کو سنبھالو۔ انسان اس مقام پر اگر اتنا بے بس اور مجبور ہے کہ اپنے چاہنے والوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں منوں ملتی تلے سلا آتا ہے۔“

”لیکن میری اماں ہی کیوں۔ ان کے علاوہ اور کوئی کیوں نہیں مر گیا؟“ وہ عجیب بچکانہ اور ضدی انداز میں بولتی دوبارہ رونے لگی تو وہ بڑی بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

”دیکھو تمہارے اس طرح رونے سے اماں کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔ یاد ہے کتنا ناراض ہوتی تھیں وہ تمہارے رونے پر۔“

اس کی یہ بات کچھ کارگر ثابت ہوئی وہ اماں کو ناراض کرنے کا بھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے چہرے کو خشک کرتے ہوئے بولی۔ ”میں روتی نہیں رہی۔“

”شباباش اب رونا بھی نہیں۔ اگر اماں کی یاد آئے تو بجائے رونے کے ان کے لیے قرآن پڑھو۔ اللہ سے ان کی بخشش اور مغفرت کی دعا میں مانگو۔ تم دیکھنا ایسا کر کے ہمیں خود بھی بہت سکون ملے گا۔“ وہ کچھ مطمئن ہو کر بولا۔ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے پوچھا۔  
”تم نے کچھ کھایا؟“

”وہ ذکیہ آئی نے کھانا بھجوا دیا تھا۔ لیکن میرا دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے ایسے ہی بچن میں رکھ دیا۔“

وہ اس کے اتنے سکون انداز پر حیران ہو رہی تھی۔ کیا حسن کو اماں کے چلے جانے کا کوئی غم نہیں۔ نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں خود گواہ ہوں۔ یہ اماں سے کتنا پیار کرتا تھا۔ شاید دنیا میں سب سے زیادہ۔ پھر اس وقت یہ اتنا مطمئن اور پرسکون کس طرح ہے۔

وہ اس کی سوچوں سے بے نیاز سی پرسکون لہجے میں بولا۔ ”آؤ۔ پھر کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔“

وہ کھانا اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا وہ پانچار اس کے ساتھ کمرے سے نکل کر بچن میں آئی اور ذکیہ آئی کی کچھنی گئی ٹرے اٹھا کر ڈائننگ ٹیبل پر لا کر رکھ دی۔ وہ بڑی خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک آدھ نظر اس کی طرف بھی ڈال لیتا تھا جو بیٹ میں ڈلے چاولوں سے پھیل رہی تھی۔ اس نے شاید ایک نوالے کے بعد کچھ اور کھایا ہی نہیں تھا۔ اس نے اسے ٹوکا نہیں اور تھوڑے سے چاول کھا کر اٹھتا ہوا بولا۔

”میں تمہارے لیے بڑی مزے دار سی چائے بنا کر لاتا ہوں۔“ وہ کوئی جواب دیے بنا یونہی بیٹھی اس کرسی کو دیکھتی رہی جس پر اس کی پیاری اماں بیٹھا کرتی تھیں۔ وہ چائے بنا کر لایا تو وہ اپنے برابر موجود اس کرسی کی گدی پر ہاتھ پھیرتی شاید منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ وہ قصداً ”اس منظر سے نگاہیں ہٹا کر بڑی خوش حالی سے بولا۔

”تو ذرا کچھ کرناؤ۔ کیسی چائے بنائی ہے میں نے؟“ فاطمہ کے لیے اس کے تمام رویے حیران کن تھے۔ کیا وہ پھر کا ہو چکا ہے۔ ”یہ رونا کیوں نہیں۔ اسے میرے ساتھ مل کر رونا چاہیے۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔

”فاطمہ! مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ کچھ دیر بعد اس نے حسن کی آواز سنی۔ اس

نے سوالیہ نظریں سے اسے دیکھا تو وہ کپ میز پر رکھے ہوئے بولا۔

”وہ بات یہ ہے کہ“ وہ اپنی بات اوصوری چھوڑ کر پتا نہیں کیا سوچنے لگا تھا۔ جیسے اپنی بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ اس کے لیے تو آج صبح کا ہر انداز ہی نرالا اور انوکھا تھا۔ وہ اپنے پر اعتماد اور دو لوگ انداز میں بات کرنے والا۔ آج اپنی بات کہنے کے لیے اسے اتنی مشکل کیوں پیش آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بہت بھگتے ہوئے بولا۔

”جب تک اماں ہمیں تب تک تو کوئی بات نہیں تھی مگر اب تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔“ وہ سادگت رہ گئی۔ شاید اس کی سماعت نے دھوکا کھایا ہے۔ جبکہ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

”تم سمجھ رہی ہو میں میری بات دیکھو پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے ایک بہت ہی اچھے ہاسٹل میں تمہاری رہائش کا انتظام کر دیا ہے۔ تم وہاں آرام سے رہو گی۔ کوئی پر اہم نہیں ہو گا۔ میں بھی آتا جا رہا ہوں گا۔ پھر تم اگر چاہو تو یونیورسٹی میں اپڈیشن لے لیتا۔ اس طرح مصروف ہو جاؤ گی اور تمہاری اوصوری تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے اب اپنے انہی اعتماد سے اس کو دیکھ رہا تھا اور اس کی سمجھ میں صرف یہ بات آ رہی تھی کہ وہ اسے اس کے اپنے گھر سے نکل جانے کے لیے کہہ رہا ہے۔ برسوں پہلے کسی کا کہا جملہ اس کے ذہن میں گون رہا تھا۔

”آج سے تم میری بیٹی ہو اور یہ گھر تمہارا ہے۔ یہاں کی ہر چیز تمہاری ہے جیسے چاہے استعمال کرو۔ بھی اس گھر کو پر ایامت سمجھا۔ اگر تم نے ایسا سمجھا تو میں اس وقت تم سے ناراض ہو جاؤ گی۔“

وہ اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے بے نیاز کہہ رہا تھا۔ مکمل میں ہمیں چھوڑ آؤں گا۔ تم رات بھر میں بھی بیٹنگ کر سکتی ہو کر لو۔ جو چیزیں وہ چاہیں گی وہ بعد میں آتی رہیں گی۔ فی الحال جو ضروری چیزیں

ہیں وہ پیک کر لو۔ میں کل صبح ناشتے کے بعد جنمیں چھوڑ آؤں گا۔“ اس کا بتواب نے بغیر وہ اٹھ گیا اور ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔



اس نے جس گھر میں آٹھ کھولی وہ ایک چھوٹا سا دو کمرہ پر مشتمل بوسیدہ سا مکان تھا۔ اس کے بعد کیے بعد دیگرے چار مردہ بچوں کی پیدائش نے اس کی بیمار اور کمزور ماں کو وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنی ماں کو سہیلی چھینیں پر بٹھکے مٹلے والوں کے کپڑے پہنے اور مسلسل کھانسی ہی دیکھا تھا۔ ان دنوں وہ سوچا کرتی کہ پتا نہیں اس کی ماں ہر وقت بیمار کیوں رہتی ہے۔ گھر میں بس وہ دونوں ماں بیٹی رہتی تھیں۔ اب بھی کھار آتے ان کے آتے ہی وہ کسی کونے میں پھس جاتی۔ وہ چیخ چیخ کر ماں سے لڑتے اپنے نشے کے لیے ماں کی محنت کی کمائی چھینتے اور جو مال دینے سے انکار کرتی تو اسے روٹی کی طرح دھتک کر رکھ دیتے اور وہ کسی کونے میں دبی یہ سب دیکھے جاتی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو جائے اور ان سے پیچ کر کہے۔

”مت اٹھاؤ میری ماں پر ہاتھ۔ اب اگر ہاتھ اٹھایا تو تمہارا ہاتھ توڑ دیں گی۔“ مگر وہ آٹھ لوسالہ بچی یہ سب سوچ ہی سکتی تھی۔ کبھی عمل نہ کر سکتی۔ اس کے دوھیائی رشتہ دار تو ان کی غیبت اور اپائی بڑی صحبت اور نشر جیسی لعنت کی وجہ سے ان سے ملنے نہ تھے اور تنخیال میں سوائے ایک خالہ کے اور کوئی تھا ہی نہیں۔

خالہ کبھی سال دو سال میں پتھر لگاتیں۔ اماں لاکھ ان کے سامنے بھرم رکھنے کی کوشش کرتیں مگر وہ سب جانتی تھیں ہر بار اصرار کرتیں۔

”میرے ساتھ کراچی چلو۔ تمہارا علاج کرواؤں گی۔ کیوں ایسے آدمی کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔“ مگر اماں ہر بار ان کو ٹال دیتیں۔ جس روز اس کے ابا کا ایک سیڈنٹ میں مارے



گئے۔ وہ بے تحاشا خوش ہوئی تھی۔ اپنے سکے باپ کے مرنے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ”ہاں“ اب وہ کبھی میری اماں کو مارنے اور ان سے پیسے چھیننے نہیں آیا کریں گے۔“ اس کی ماں پتا نہیں کس مٹی کی بنی تھی، ایسے شخص کے لیے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی جو اس کے لیے ہیش باعث آزار رہا۔

اماں سے شاید ابا کی جدائی برداشت نہ ہو رہی تھی یا وہ ان کے ہاتھوں پٹنے کی اتنی عادی ہو چکی تھیں کہ ان کے مرنے کے تین ماہ بعد خود بھی ملک عدم کی جانب روانہ ہو گئیں۔ وہ اپنے تہارہ جانے پر حیران بریشان اپنے گرد موجود لوگوں کو دیکھ رہی تھی جب وہ متشفق ہستی آگے بڑھی اور اسے اپنے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اسے خالہ میں سے اماں کی خوشبو آرہی تھی وہ ان کے گلے لگی سمی نگاہوں سے اماں کے مرنے پر جو دکھ دیکھتی رہی۔

خالہ اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ تو سوئم کے بعد ہی چلا گیا جبکہ خالہ اس کے پاس رک گئیں۔ وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کرتیں۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتیں۔ ”رونا نہیں۔ تم تو میری بہت پیاری بیٹی ہو۔ اور تمہاری اماں تو میں ہوں۔ تم مجھے اماں کہا کرو۔“ اسے بس یہ پتا تھا کہ ان کے پاس سے اماں کی خوشبو آتی ہے ان کی شکل اماں جیسی ہے اور وہ مطمئن ہو کر ان کے پاؤں پر سر رکھ کر سو جاتی۔

مہینہ بھر وہ وہاں نواب شاہ میں اس کے ساتھ رہیں اور پھر ایک روز اس سے بولیں۔ ”چلو میری جان! میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی میری صفیہ کی نشانی۔“ وہ اسے سینے سے لگا کر دوبارہ رونے لگیں اور وہ چودہ سالہ لڑکی بغیر کوئی سوال کیے ان کے ساتھ چلی آئی۔

خالہ نے اس ایک ماہ کے قیام کے دوران اس کا گھر اور گھر میں موجود تمام سامان فروخت کر دیا تھا۔ گو اس وقت وہ بہت چھوٹی اور نا سمجھ تھی مگر پھر بھی اسے اپنے اس کھنڈر نما گھر کے ڈیڑھ لاکھ روپے میں بیک جانے پر خاصی حیرت ہوئی تھی۔ وہ خالہ کی زبانت کی دل ہی دل

میں معترف ہو گئی تھی۔ وہ اس کی ماں کے برعکس بڑی بُرا اعتماد سی تھیں۔ مکان کی فروخت کے سلسلے میں فاطمہ نے انہیں کتنی ہی بار مختلف مردوں سے خود اعتمادی اور برابری کی سطح پر بات کرتے دیکھا تھا۔

نواب شاہ سے کراچی تک کا سفر خالہ کی سنگت میں کٹا۔ وہ راستے بھر اسے کراچی کے بارے میں بتاتی رہیں۔ ان دنوں اس کے لیے کراچی لندن اور نیویارک جتنا دور اور ناقابل رسائی شہر تھا۔ عزیز آباد میں واقع وہ سوا سو گز کا مکان اسے اپنے کھنڈر کے مقابلے میں جنت محسوس ہوا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی خالہ نے اس سے کہا تھا۔

”آج سے تم میری بیٹی ہو اور یہ گھر تمہارا ہے۔ یہاں کی ہر چیز تمہاری ہے۔ جیسے چاہے استعمال کرو۔ کبھی اس گھر کو پر ایا مت سمجھنا۔ اگر تم نے ایسا سمجھا تو میں اسی وقت تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔“

حسن نے اس کے آنے پر کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا تھا۔ نہ اسے گرم جوشی سے مسکرا کر خوش آمدید کہا تھا اور نہ ہی منہ بگاڑ کر اس کے آنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ وہ بڑا کم گو اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا لڑکا تھا۔ صبح یونیورسٹی چلا جاتا اور واپس آکر یا اپنی کتابوں میں گم ہو جاتا یا کمپیوٹر کے آگے جم جاتا۔ وہ فاطمہ سے پانچ سال بڑا تھا مگر اس کی سنجیدگی اور میچورٹی سے خائف ہوتے فاطمہ کو وہ اپنے سے دس پندرہ سال بڑا محسوس ہوتا تھا۔ وہ گئیں اماں تو وہ اس پر اپنی جان بچھاؤ کرنے کو تیار تھیں۔ ان کی بے تحاشا محبت پر وہ حیران رہ جاتی۔ ان کی چاہت میں اتنی وارفتگی اور سچائی تھی کہ وہ کچھ ہی عرصے میں اپنے ماں باپ اور نواب شاہ کے اس چھوٹے سے گھر کو بھول گئی۔ اس کے لیے اچھے اچھے کپڑے بنا رہی ہیں اسے اس کی پسند کی چیزیں پکا کر کھلا رہی ہیں۔ ان کا سارا دن اس کی سیوا میں گزر جاتا اور وہ کم عمر اعتماد سے محروم اور بزدل سی لڑکی اپنے لیے ان کی اتنی محبت اور چاہت پر حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہ جاتی۔

اس کی ماں اور اماں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بظاہر ایک ہی ماں باپ کی اولاد وہ دونوں بہنیں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ حالانکہ نانا، نانی نے تو دونوں ہی بیٹیوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہوئے انہیں آٹھ جماعتیں پڑھا کر رخصت کر دیا تھا۔ اب شاید یہ نصیب کی بات تھی کہ اس کی ماں کے مقدر میں ابا جیسے بد قماش، شرابی اور جوار کی بیوی بننا لکھا تھا اور اماں کی قسمت میں خالو جیسے اچھے انسان کا ساتھ لکھا تھا۔ خالو نے شادی کے بعد اماں کو ہی اسے تک بڑھایا تھا۔ وہ خود بڑے قابل آدمی تھے۔ انہوں نے ٹیمسٹری میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا ہوا تھا اور کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کہتے ہیں کہ اگر آپ کے پاس پیسے ہیں تو نئے جوتے مت خریدیں بلکہ کوئی کتاب خرید لیں۔ اسے یہ تمام باتیں اماں نے بتائی تھیں۔

وہ جب بھی خالو کا ذکر کرتیں ان کے چہرے پر اتنے خوبصورت رنگ بکھر جاتے کہ وہ مبہوت ان کو دیکھتی رہ جاتی۔ انہوں نے خالو کے ساتھ بڑی خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری تھی۔ وہ بتاتیں کہ شادی کے دس سال بعد تک ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی مگر خالو نے اس بات پر کبھی انہیں تنگ نہ کیا بلکہ الٹا ہمیشہ انہیں دلاسا دیتے کہ یہ خدا کی مرضی پر ہے، وہ اگر چاہے تو ہمیں اولاد دے اور اگر ہمارے نصیب میں نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ ہم اس کی رضا میں راضی ہیں۔

پھر دس سال بعد ان کے سونے آگن میں حسن عباس کی آمد ہوئی تو ان کی زندگی میں بہار آگئی۔ خالو نے اسے بہترین تعلیمی ادارے میں داخلہ دلوا لیا۔ وہ اپنے بیٹے کو خوب لائق فائق اور کامیاب دیکھنا چاہتے تھے مگر جب حسن صرف چھ سال کا تھا، وہ اماں اور حسن کو اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مگر ان کا دیا ہوا اعتماد اور محبت اماں کا زاویرا بن گئی۔ انہوں نے اپنی تعلیم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک اچھے



تھا۔ مگر اس روز ناشتے کی میز پر حسن نے اسے اور اماں کو بری طرح حیران کر دیا۔

وہ یونیفارم پہنے حسب معمول ناشتہ کرنے میں غرے دکھائی دی تھی اور اماں اسے چکار چکار کر زبردستی کھلا رہی تھیں۔ اسی وقت حسن بڑا تیار ہو کر ڈانٹنگ روم میں آیا اور کرسی تحیث کر بیٹھا تو اماں پوچھنے لگیں۔

”خیر بت! اتنی صبح صبح کہاں جا رہے ہو؟“ جواب میں وہ بڑے اطمینان سے چائے پیتے ہوئے بولا۔

”آج میری جاب کا پہلا دن ہے۔ دیکھ نہیں رہیں آپ! کتنا تیار ہو کر جا رہا ہوں۔“ وہ بڑی شگفتگی سے مسکرایا اور اماں کا تو یہ خیال تھا کہ منہ بھائے اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے چہرے پر نظریں ڈالے بغیر ناشتہ کرنے میں مصروف رہا۔ کافی دیر تک جب وہ اپنی بات کی وضاحت میں مزید کچھ نہ بولا تو اماں بڑی دقتوں سے خود کو بولنے کے لیے آمادہ کر پائیں۔

”حسن! تمہارا دلغ خراب ہو گیا ہے۔ کیا الٹی سہی باتیں کر رہے ہو۔“ قصے سے زیادہ ان کے لہجے میں افسوس کی جھلک تھی۔

”میری سوئیٹ اماں! اس میں دلغ خراب ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ کے بیٹے کو بغیر کسی سفارش کے اتنی اچھی فرم میں جاب ملی ہے اور آپ ناراض ہو رہی ہیں۔“ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بڑے مطمئن انداز میں بولا۔ تو اماں اپنا غصہ دبان پائیں۔ ”حسن! بند کرو یہ بکواس! بجائے اپنے جانے کی تیاری کرنے کے تمہیں کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔“

”اماں پیاری! آپ نے وہ مقولہ تو ضرور سنا ہو گا کہ۔۔۔ ”is better that learning“ (کمانا علم حاصل کرنے سے بہتر ہے) بس میں بھی اسی پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔ اچھا باقی باتیں شام میں ہوں گی۔ خدا حافظ۔“

کی دور میں ان کے ام آ رہا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ دوسروں کے کام آنا عین ثواب ہے۔ وہ ہمارے جہاں کا دور ہمارے جگہ میں ہے۔“ کی عملی تفسیر تھیں۔

وقت چمچہ اور آگے بڑھا۔ وہ میٹرک کر کے کالج میں آئی۔ اسکول تک تو اماں کا ساتھ تھا۔ وہ ان ہی کے ساتھ جاتی اور آتی تھی۔ اب کالج جانے کا مرحلہ آیا تو اماں نے اسے قریب ترین سائنس اینڈ کامرس کالج میں داخلہ دلوا کر اس کی پریشانی کم کر دی۔ وہ باوجود دو سال یہاں رہنے کے اپنے اندر کا ڈر اور خوف ختم نہ کر سکی تھی۔ اماں کے بغیر وہ کبھی اکیلی محلے میں کسی کے گھر نہ گئی تھی۔ کالج پیدل کا راستہ ہونے کے باوجود وہ فرناز اور صنوبر کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ اگر کسی روز وہ چھٹی کر لیتیں تو خود بھی پائیلے جانے کے خوف سے چھٹی کر کے گھر بیٹھ جاتی۔ شاید یہ خوف اس کے اندر بچپن ہی سے بیٹھ گیا تھا۔ جب ابا شراب کے نشے میں دھندل کو مارا پینا کرتے تھے یا کوئی اور بات تھی مگر وہ اپنے اندر اعتماد پیدا کرنے میں ہنوز ناکام تھی۔ مزید کمر اماں کے لاڈ سے پوری کر دی تھی وہ اسے ہتھیلی کا چھال بنا کر رکھتیں۔ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر سلایا کرتیں۔ گلی کے آخر میں فرناز کے گھر بھی اگر اسے جانا ہوتا تو اماں خود چھوڑ کر آتیں۔

ان ہی دنوں حسن نے بی سی ایس میں ٹاپ کرنے کے ساتھ گولڈ میڈل اور مزید تعلیم کے لیے امریکہ کی اسکالرشپ اپنی یونیورسٹی کی جانب سے حاصل کی تو اماں خوشی سے پاگل ہو گئیں۔ شاید اپنی ریاضت کا بیٹھا پھل انہیں خوش کر رہا تھا یا عزیز اذان شوہر کے سامنے سرخروئی پر وہ شانمان تھیں فاطمہ سمجھ نہ سکی۔ وہ خود بھی اب اس گھر کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ اس لیے اس خوشی میں وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ شریک تھی۔ اس نے حسن سے ٹریٹ کی فرمائش کی تو اس نے مسکرا کر ہائی بھری اور پھر رات میں دو اسے آکس کریم کھلا کر لایا۔ اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر جانے اور آکس کریم کھانے کو اس نے خوب انجوائے کیا

اس کے استفسار پر اماں نے اسے بتایا تھا کہ وہ شام میں کسی کوچنگ سینٹر میں پڑھاتا ہے۔ اسے اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے ماں سے پیسے لینے اچھے نہیں لگتے۔ اماں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”بالکل اپنے بابا پر گیا ہے۔ ہر بات پر اس کی ناک نیچی ہوتی ہے۔ اسے لیول تک بھی پتا نہیں کیسے خاموش رہ گیا۔ اب کہتا ہے کہ مجھے تو یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ آپ گھر کا خرچ چلانے کے لیے نوکری کر رہی ہیں کجا کہ میں اپنے ذاتی خرچوں کے لیے آپ سے رقم لوں۔“

وہ بڑا پڑھا کو اور جنس تھا۔ فاطمہ اس سے بری طرح مرعوب تھی۔ ان دنوں کے درمیان بڑی رکی سی بات چیت ہوتی تھی۔ وہ گھر پر کتنا ہی بست کم تھا۔ اماں اور اپنے دو چار دوستوں کے علاوہ وہ کسی کو بھی خود سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا۔ وہ زیادہ وقت وہاں اپنے کپیوٹر کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ کبھی کبھار اس کے دوست کمپائن اسٹڈی کے لیے اس کے ساتھ آجاتے تو وہ انہیں پچھلی طرف والے دروازے سے ڈائریکٹ اوپر اپنے کمرے میں لے جاتا۔

اماں بظاہر بڑی پڑھی لکھی ورکنگ وومن تھیں مگر بعض معاملات میں وہ بہت قدامت پسند تھیں۔ وہ خود بھی سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر گھر سے نکلا کرتیں اور اسے بھی ایسا ہی کرواتیں۔ اس لیے اس کے آنے کے بعد اس کے دوستوں کی آمدورفت پچھلے دروازے سے ہوتی اور وہ اوپر خالو کی لائبریری یا حسن کے کمرے میں جمع ہو کر پڑھا کرتے۔ ایک آدھ دفعہ وہ چائے لے کر اوپر گئی اور دروازے پر دستک دے کر اسے ٹرے پکڑائی تو اس نے ہمیشہ یہی دیکھا کہ وہ ماسٹر صاحب بنا اپنے دوستوں کو کچھ نہ کچھ سمجھا رہا ہے۔ بعد میں جب اس نے اماں کو یہ بات بتائی کہ کمپائن اسٹڈی کا تو صرف بنانا ہے اس کے دوست اس سے مفت میں ٹیوشن پڑھنے آتے ہیں تو اماں اس کی بات پر ہنسی تھیں اور پھر اس سے کہا تھا کہ اگر وہ دوستوں کو پڑھا رہا ہے یا

انگلش میڈیم اسکول میں نوکری کرنی اور بیٹے کی تعلیم اور دیگر ضروریات میں کبھی کوئی کمی نہ آنے دی جس سے اسے احساس ہو کہ میرا پاپ نہیں ہے۔ خالو ایک خوددار اور وضع دار انسان تھے اس لیے ترکے میں کوئی لمبی چوڑی جائیداد چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ بیوی اور بیٹے کے لیے یہ مکان ہی ان کا کل سرمایہ تھا۔ اماں بتاتی تھیں کہ وہ بڑے اناوائے اور غیور تھے ساری زندگی کسی کی خوشامد نہ کی۔ کسی سے اس خیال سے نہ ملے کہ یہاں سے کوئی فائدہ حاصل ہو گا اور ان خصوصیات کے حامل شخص کا ترکہ اس سے زیادہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

اماں نے اسے اپنے ہی اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ وہ نواب شاہ سے نوین جماعت میں پڑھتی ہوئی آئی تھی۔ کہاں اس کا وہ چھوٹا سا سرکاری اسکول اور وہاں کی ٹیم خواندہ پیچرز اور کہاں یہ بڑا انگلش میڈیم اسکول اور اس کے قابل اساتذہ۔ گو وہ پڑھنے میں اچھی تھی مگر اس کی انگریزی بہت کمزور تھی اور یہاں تمام مضامین انگریزی ہی میں پڑھائے جاتے تھے اس لیے وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ یہاں بھی اماں ہی اس کے کام آئیں۔ اسکول سے آکر وہ روزانہ تین چار گھنٹے اسے انگلش سمجھایا کرتیں۔ شروع میں اسے مشکل پیش آئی مگر آہستہ آہستہ وہ سیکھتی چلی گئی۔ مگر پھر بھی اسے اپنی کاپس فیلو کی طرح روانی سے انگریزی بولنی نہیں آسکتی تھی۔ اس کا دل چاہتا وہ اپنی سپیلیوں کی طرح فرزا انگریزی بول سکے یا اماں کی طرح جی وی پر انگریزی پروگرام دیکھ سکے اور انگریزی اخبار پڑھ سکے۔ اماں اس کی ان باتوں پر اسے تسلی دیا کرتیں کہ اسے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ انشاء اللہ یہ سب کچھ محنت اور کوشش سے سیکھ جائے گی۔

اسے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ حسن سارا دن گھر سے باہر کہاں رہتا ہے۔ صبح یونیورسٹی چلا جاتا۔ وہاں سے آکر کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتا اور دوبارہ گھر سے غائب ہو جاتا پھر رات کو واپس آکر اپنے کمرے میں بند ہو کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ وہ ان دنوں بی ایس سی کر رہا تھا۔



وہ بڑے سکون سے اپنی بات ختم کر کے چلا گیا اور  
اماں لکھتی ہی دیر آنکھوں میں آنسو بھرے بیٹھی رہیں۔  
رات کو کھانے کے بعد اماں کے گلے میں پائیں  
ڈالے وہ انہیں منانے میں لگا ہوا تھا۔ ان کے گھر میں  
افراد ہی کتنے تھے جو ایک دوسرے سے کوئی بات  
چھپائی جاسکے۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی اس کی باتیں سن رہی  
تھی۔ اماں کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ اتنے شاندار  
موقع سے فائدہ اٹھائے۔ اس سے بڑا بد قسمت اور  
کون ہو گا جو اعلیٰ تعلیم کے اتنے سنہری موقع کو گنوا رہا  
تھا۔ اماں اسے لعن طعن کر رہی تھیں کہ اسے کوئی  
حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے بابا کے خوابوں کو روند ڈالے  
اور جواب میں وہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا۔  
”پڑھنے کے لیے باہر جانا ضروری نہیں ہے۔  
جنہیں پڑھنا ہوتا ہے وہ یہاں بھی پڑھ لیتے ہیں اور  
جن نمکوں، ٹالا نقول کو نہیں پڑھنا ہوتا انہیں آپ  
دنیا کی اچھی سے اچھی یونیورسٹی میں بھیج دیں۔ وہ بڑے  
کر نہیں دیں گے۔“ جب کافی دیر کی بحث و تکرار کے  
بعد اماں رونے بیٹھ گئیں تو وہ کچھ جھنجھلا کر بولا۔  
”اماں! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں  
نہیں کر رہی ہیں۔ ہمارے مذہب میں تو والدین کو اکیلا  
چھوڑ کر بھانڈا نہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ امریکہ  
جا کر پڑھنا جہاں سے افضل تو نہیں ہو سکتا۔ میں آپ  
لوگوں کو اکیلا چھوڑ کر ہرگز نہیں جاسکتا۔ آپ پلیز مجھے  
میری ذمہ داری نبھانے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ بابا بھی  
میرے اس فیصلے سے خوش ہوں گے اور میں نے آگے  
پڑھنے سے انکار تو نہیں کیا۔ ایم سی ایس اور ایم بی  
اے کرنا میرے فیوچر پلانز میں شامل ہے۔ آپ بے  
فکر رہیں۔ میں خوب وزنی اور ڈھیر ساری ڈگریاں آپ  
کے قدموں میں ڈال دوں گا۔ بس تھوڑا سا انتظار  
کر لیں۔“  
اماں نے جب یہ دیکھا کہ اسے کچھ بھی سمجھانا بے  
سوہے تو مجبوراً چپ ہو گئیں۔ اس روز کے بعد اس  
موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی مگر اماں کچھ چپ چپ  
سی رہنے لگی تھیں۔ بیٹے کی ضد کے آگے ہتھیار تو

نہی نہی دیکھتے یونہی بے خیالی میں اس کی نظر فاطمہ  
پر پڑی جو بڑی بے زار سی شکل بنائے چین منہ میں  
ڈالے پتا نہیں کیا سوچنے میں مصروف تھی۔  
”کیا ہوا۔ اتنی بڑی بڑی شکلیں کیوں ہٹا رہی ہو؟“  
وہ مسکرا کر بولا۔  
”میڈم شیریں نے اتنا مشکل Essay (مضمون)  
لکھنے کے لیے دیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا  
لکھوں۔“  
وہ روٹی صورت بنا کر بولی تو وہ محفوظ نظموں سے  
اسے دیکھتا ہوا بولا ”کس ٹاپک پر لکھنا ہے؟“  
”نیو کلیئر کے فائدے اور نقصانات“ وہ موضوع بتا  
کر دوبارہ اپنے کانڈ اور قلم کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ  
بولا۔  
”اس میں مشکل کیا ہے۔ یہ تو اتنا انٹریٹنگ اور  
آسان سا ٹاپک ہے۔ ادھر آؤ میں بتاؤں۔“  
وہ شاید اس وقت بڑی فرصت سے بھی تھا اور موڈ  
بھی اچھا تھا جو اس سے اتنی تفصیلی بات کر رہا تھا۔  
فاطمہ کی تو بہت بڑی مشکل آسان ہو گئی تھی۔ جلدی  
سے اٹھ کر اس کے برابر میں آکر بیٹھ گئی اور نوٹ بک  
اور چین اسے پکڑا دیا۔ وہ قلم اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے  
بولا۔  
”اچھا لکھنے کے لیے اچھا پڑھنا بہت ضروری ہے۔  
تم کورس کی کتابوں کے علاوہ دوسری اچھی کتابیں بھی  
پڑھا کرو۔ اس سے تمہارا مطالعہ وسیع ہو گا اور تم کسی  
نئی موضوع پر آسانی سے لکھ سکو گی۔“  
پھر وہ اسے ایک اچھا مضمون لکھنے کا طریقہ  
سمجھانے لگا۔ سمجھانے سمجھانے میں وہ پورا مضمون  
لکھ گیا اور وہ کسی ٹیک بک اور فصاحت کو خاطر میں لائے  
بغیر اس بات پر خوش تھی کہ اس کا بہت بڑا مسئلہ حل  
ہو گیا ہے۔ اس کا لکھا مضمون اس نے بڑے اطمینان  
سے اپنی رینڈ رائٹنگ میں کاپی کیا اور اگلے روز جب  
میڈم شیریں نے اس کے مضمون کو بہترین قرار دیا تو وہ  
خوش سے سینہ چلا کر اور گردن تان کر بیٹھ گئی۔ میڈم  
شیریں جو اچھے اچھوں کی انگریزی میں خامیاں نکالا

کرتی تھیں اس کے مضمون کی شان میں قصیدے  
پڑھ رہی تھیں۔ اس اسائنمنٹ میں A+ (اے پلس)  
لے کر وہ بہت خوش تھی۔  
کچھ ہی دنوں بعد جب اسے لوسی گرے کا مرکزی  
خیال لکھنا تھا تو وہ حسن کے پاس چلی گئی۔  
”کیا ہوا؟ کوئی کام ہے؟“ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر  
دوبارہ کسی دھڑکی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔  
”آپ سے ایک کام ہے اگر آپ مصروف نہ ہوں  
تو؟“ وہ کچھ جھجکے ہوئے بولی۔  
”نہیں۔ میں مصروف نہیں ہوں۔ بس یہ  
انٹرایشن کر رہا تھا۔ اب فارغ ہوں۔ تم بولو کیا کام  
ہے۔“ جواب میں وہ اپنی کتاب اور ایک پیپر اس کے  
آگے کرتی ہوئی بولی ”آپ مجھے اس پونم کا مرکزی  
خیال لکھ دیں۔“  
وہ جو اس کی طرف متوجہ تھا اس کی بات سنتے ہی  
بڑے بے موت لہجے میں بولا۔  
”سوری۔ میں نہیں لکھ سکتا اور یہ انکار میں اس  
لے کر رہا ہوں کہ تم خود اپنے آپ پر بھروسہ کرنا سیکھو۔  
تم خود لکھو اگر غلط لکھا جائے گا تو کوئی بات نہیں۔ کوئی  
بھی آدمی ہمیشہ سے پرفیکٹ نہیں ہوتا سب ہی غلطی  
کر کے سیکھتے ہیں۔ میرے لکھے ہوئے کی تعریف سن  
کر تمہیں اتنی خوشی نہیں ہو گی۔ جتنی خود اپنے ہاتھ  
سے لکھ کر ہو گی۔ جاؤ شاہاں! تم خود کو بخش کرو۔ اچھا  
بابا جیسا بھی لکھا جاتا ہے لکھو اور پھر مجھے لا کر دکھاؤ۔  
اگر کوئی غلطی ہوئی تو میں تمہیک کر دوں گا۔“  
وہ دوبارہ مانیٹر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور وہ اس  
سے خفا واپس نیچے آئی تھی۔ کیا ہو جانا اگر وہ لکھ دیتا۔  
خود کی انگلیں ذرا سی اچھی کیا ہے اپنے آگے کسی کو کچھ  
سمجھتے ہی نہیں۔ پھر اس نے اماں سے پوچھ کر لکھ  
لیا تھا۔ حسن صبح کا کیا رات کو گھر آتا تو کھانا کھا کر اپنے  
کمرے میں ٹھس جاتا تھا۔ اسے تو شاید پتا بھی نہیں  
چلا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہے۔  
اگر کے امتحانوں کے فوراً بعد فرنازی شادی تھی  
اور وہ اس میں بڑے زور و شور سے شرکت کر رہی



تھی۔ اماں نے تمام فنکشنز کے لیے اسے جوڑے بنا کر دیے تھے۔

اس روز فرناز کی مایوں تھی۔ وہ پہلے رنگ کا کرتا پہنچا۔ اور بڑا سالال اور پہلے رنگ کا چٹری کا پوشہ اوڑھ کر خوب دل سے تیار ہوئی تھی۔ اس کی تیاری ہوتی بھی کیا تھی؟ اماں کو تو کئیوں کا زیادہ ہناؤ سنگھار پسند نہ تھا۔ اس لیے اس کا میک اپ کا بل اور پر فیموم پر مشتمل تھا۔ وہ نول ہاتھوں میں بھر بھر کا کچ کی چوڑیاں پہنے اور بالوں میں پرانہ ڈالے وہ تیار ہو کر نکلی تو لاؤنج میں حسن بیٹا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کا دل عجیب انداز سے دھڑک اٹھا۔ چنانچہ کیا بات تھی وہ اپنے اس خود میں گمن اور لا پرواہ سے کزن کے بارے میں کچھ عرصے سے بڑے مختلف انداز میں سوچنے لگی تھی۔ اپنی یہ سوچیں اسے خود ہی ہراساں کر رہی تھیں۔ وہ ایسی کسی بات کا خود سے بھی اعتراف کرتے ڈرتی تھی۔ مگر اس وقت وہاں حسن کو پیشوا دیکھ کر اس کا بے ساختہ دل چاہا کہ وہ ایک ستاسی نگاہ اس کی طرف ڈالے۔ مگر وہ سرسری سے انداز میں اسے دیکھ کر اپنی باتوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس کا دل اس کی بے اعتنائی پر کچھ بھجھ سا گیا۔ اپنی اس کیفیت پر وہ خود کو سرزنش کر رہی تھی کہ اماں وہاں آگئیں اور خوب اس کی بلا میں لیں، باقاعدہ نظر اتاری۔ اس کے بعد حسن سے بولیں۔

”بیٹا! رانی کو چھوڑ آؤ۔“ وہ رہنمائی دے کر اماں کی طرف متوجہ ہوا۔

”کہاں چھوڑنا ہے؟“

”ڈک کے گھر اور کہاں؟“ اماں کے جواب پر وہ کچھ

جھنجھلا کر گھڑا ہوا اور بولا۔

”اپنی ہی گلی کے کسی گھر میں یہ اہلی نہیں

جاسکتی۔“ پھر اماں کا جواب نے بغیر لیسپر پاؤں میں

ڈالتے ہوئے بے زاری سے بولا ”تو“ وہ اس کی بے

زاری اور ناراضی پر حیران ہوئی اس کے پیچھے ہوئی۔

اس کے بارے میں ہر فیصلہ اماں ہی کیا کرتی

تھیں۔ اس کے کپڑوں جوتوں سے لے کر پڑھائی تک

وہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اماں کی محتاج تھی۔ اسے اپنی پسند پر بالکل بھی بھروسہ نہ تھا۔ بازار جا کر اگر اماں کہیں بھی کہ وہ خود پسند کرے تو وہ بڑی حاجت سے ان کا بازو تھام کر کہتی۔ ”اماں آپ کی پسند زیادہ اچھی ہے آپ جو کریں۔“ اور وہ اسے ٹوکے بغیر خود ہی اس کے لیے تمام چیزیں پسند کر لیتی۔

تھوڑا عرصہ کا وقت کیا تو چونکہ اس کے کالج

میں بی ایس سی کی کلاسیں نہیں ہوتی تھیں اس لیے

اماں نے اسے بی ای سی اچھا لیس کالج میں داخلہ دلا

دیا۔ مضامین کا انتخاب بھی اماں ہی نے کیا تھا۔ گو کالج

آنے جانے کے لیے اسے دین لگا کر دی تھی مگر وہ

پھر بھی بڑی ڈری ہوئی تھی۔ اس سے پہلے اسکول اماں

کے ساتھ اور کالج سہیلیوں کے ساتھ جایا کرتی تھی۔

اب اتنی دور آتا جانا سے ڈرا رہا تھا۔ کچھ وقت گزر تو وہ

نئے ساحل میں تھوڑی مدت ایڈجسٹ ہوئی تھی۔

تھوڑا عرصہ کے امتحان سر رہے تھے اور آج جرح

Certify (چیک) کروانے کی آخری تاریخ تھی۔ وہ

بے چینی سے دین کا انتظام کر رہی تھی۔ جب کالی دیر

گزر گئی اور دین نہیں آئی تو وہ روئی شکل بنا کر گیسٹ ہند

کرتی لاؤنج میں آگئی۔ جہاں حسن اخبار پڑھ رہا تھا۔

اماں شاید اس کے لیے ناشتہ بنا رہی تھیں۔ حسن کے

آگے بٹھرتے ہوئے وہ اس سے بولیں۔

”لگتا ہے تمہارا دین والا آج گول ہو گیا ہے۔“

وہ جواب میں رو یا کسی آواز میں بولی ”آج میرا چائنا

انتا ضروری ہے۔ اب میں کیا کروں۔“

اماں اپنی لاؤنج کی آنکھوں میں آنسو کہاں دیکھ سکتی

تھیں۔ فوراً ”حکم صادر فرمایا۔“ ”حسن! آئیں جاتے

ہوئے رانی کو کالج ڈراپ کرونا۔“

اماں کے اس شای فرمان پر وہ جل کر رہ گیا آج

اسے آئیں جلدی پہنچنا تھا۔ اب ان محترمہ کے ساتھ

خواری اٹھاؤ۔ وہ بے مزہ ہوا۔ مگر اماں کے حکم سے

سر تابی کی مجال بھی نہ تھی اس لیے سر ہلا دیا۔

اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھی وہ تمام قرانی آیات جو

اسے یاد تھیں کا ورد کر رہی تھی۔ وہ بائیک چلا نہیں

سکتی۔ اڑا رہا تھا۔ اس کے کندھے کو مضبوطی سے جکڑ کر بیٹھی وہ اپنے اگلے پیچھے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی۔ اسے جتنی جلدی تھی۔ اتنی ہی دیر لگ رہی تھی۔ بمشکل آدھا راستہ ہی طے کیا ہو گا کہ بائیک پچھڑ ہو گئی۔ وہ بری طرح جھنجھلا رہا ہوا تھا۔ اس کی طرف ایک تھرر سائی نظر ڈال کر وہ بائیک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بائیک کا بغور محاسبہ کر کے وہ اس سے بولا۔

”تم ہمیں رکو۔ میں یہ سامنے جو موٹر کیلنک ہے“

وہاں تک جا رہا ہوں۔“

اس کی طرف دیکھ کر بغیر وہ بائیک گھسیٹا ہوا آگے

بڑھ گیا اور وہ خوف میں گھڑی وہاں کھڑی رہ گئی۔ روڈ

کے کنارے فٹ پاتھ پر چڑھی وہ خوف و ہشت سے

کانپ رہی تھی۔ پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کا

خوف زود چودہ گیارہ گھنٹہ کر حیران رہ گیا۔

”کیا ہوا؟“

جواب میں وہ بڑی گھٹی گھٹی آواز میں بولی

”مجھے اتنا ڈر لگ رہا تھا۔ یہ سامنے جو آوی کھڑا ہے“

اتنی دیر سے ہمیں دیکھ جا رہا ہے۔“

اس کی بات پر حسن نے بڑے غصے سے اس طرف

دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہی تھی تو یہ دیکھ کر سر پیٹ کر

رہ گیا کہ وہ بے چارے ایک ضعیف سے آدمی تھے۔ جو

شاید روڈ کراس کرنے کے لیے ٹریفک رکنے کا انتظار کر

رہے تھے۔ وہ جو اس خیال سے مرہ تھا کہ کون سے جو

اس کی کزن کو گھور رہا ہے ابھی اس کا دل ٹھیک کرتا

ہو اس پر ایک خاموشی نظر ڈال کر ان بڑے میاں کی

طرف بڑھ گیا اور روڈ کراس کر کے ان تک پہنچا۔ پھر

ان کا ہاتھ تھام کر انہیں روڈ پار کرانا اس کے پاس چلا

گیا۔ اس سے کچھ کہنا بے کار محسوس ہوا، اس لیے

خاموش ہی رہا اور اسے کالج ڈراپ کر کے خود آئیں چلا

گیا۔

ساتھ والی صبا بھائی کے ہاں پہلے بچے کی ولادت

ہی اور ان کے ساتھ باپ شل جانے والا لڑکی نہ تھا۔

اماں اپنی ہمدرد طبیعت سے مجبور ہو کر ان کے ساتھ

جلی گئیں اور پھر رات میں فون کر کے کہہ دیا کہ وہ صبح آئیں گی۔ حسن اماں کا پیغام سن کر گھبرا کر کہنے لگا کہ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اماں کے بغیر اکیلے نیچے رہنے کا تصور اس کے لیے بڑا ہی خوفناک تھا۔ کچھ دیر بیٹھی فی وی دیکھتی رہی مگر جب ڈر کسی بھی طرح کم نہ ہوا تو بھاگ بھاگ اس کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ پروسیر کھولے کوئی کام کر رہا تھا۔ اسے آنا دیکھ کر بولا۔

”یقیناً“ آپ کو ڈر لگ رہا ہو گا؟“

وہ اس کا طنز انداز نظر انداز کر کے بولی۔ ”ہاں۔“

مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔

آج آپ نیچے لاؤنج میں سو جائیں۔“

”اور جو مجھے اتنا سارا کام کرنا ہے۔ اس کا کیا

ہو گا؟“ وہ اپنے کام میں مصروف بولا۔

”پلیز میری خاطر۔“ وہ احتجاجی انداز میں بولی۔

”آپ کی خاطر آئیں میں جھڑکیاں کھاؤں۔ مجھے

بہت کام ہے چاہیے۔“

وہ بڑی بے زاری سے اس پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ

اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ وہ وہیں کھڑی رہنے لگی۔

اس کے رونے پر اس نے بڑی کوفت سے اس کی

طرف دیکھا اور بولا۔

”چلو نیچے میں آ رہا ہوں۔“

وہ آنسو صاف کرتی خوش خوش نیچے آئی۔ کچھ دیر

بعد وہ بھی بڑی ناراض شکل بنائے تنگی ہاتھ میں

اٹھائے نیچے آیا اور لاؤنج میں کارپٹ پر تنگی رکھ کر

لیٹ گیا۔

اس کے آنے پر اس نے سکون کا سانس لیا اور پھر

لاؤنج اور اپنے کمرے کے درمیان موجود کھڑکی کھول کر

خود بھی لیٹ گئی۔ رات میں نئی پار اٹھ کر اس کی

موجودگی کا یقین کیا۔ وہ سوئے میں بھی ناراض نظر آ رہا

تھا۔

اگلے روز رات میں وہ بچن میں چائے بنا رہی تھی

جب اس نے حسن کی آواز سنی وہ اماں سے کہہ رہا

تھا۔

”آپ کے غیر ضروری لاڈیاری نے اس کا ستیا ناس



کر دیا ہے۔ اتنی بڑی لڑکی بچوں جیسی حرکتیں کرتی ہے۔  
 ”کوئی نہیں“ اتنی پیاری ہے میری بیٹی۔ تم خواہو  
 اس کے دشمن مت بنو۔“ ماں نے بیٹی کی بات کو کوئی  
 اہمیت دے بغیر کہا تو وہ خوش ہو گئی۔  
 ”ماں! میں اس کی دشمنی میں نہیں کہہ رہا۔ ذرا  
 سوچیں آپ یا میں آخر کب تک اس کی انگلی پکڑ کر  
 اسے چلائیں گے۔ میرے بجائے آپ کا رویہ اس کی  
 دشمنی پر مبنی ہے۔ اتنی بڑی گروں اپ لڑکی اکیلے  
 سونے سے ڈرتی ہے اس کے خیال سے روڈ پر چلنا ہر  
 دوسرا شخص اسی کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ اکیلی اپنی ہی گلی  
 میں کیس نہیں جاسکتی۔ آخر اس کا بے گناہ کیا۔ اس  
 طرح وہ زندگی کیسے گزار پائے گی؟“  
 ماں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔  
 ”تم اس کے غم میں جھکا مت ہو۔ میری بیٹی جیسی  
 بھی ہے۔“ سچ کل کی چیز چالاک لڑکیوں سے بہت بہتر  
 ہے اور اللہ نہ کرے اس کی زندگی میں کوئی ایسے ویسے  
 حالات آئیں۔“  
 وہ ان کی بات پر منہ بنا کر چپ ہو گیا اور فاطمہ کے  
 دل میں اس کے خلاف گرہ پڑ گئی۔  
 اس بار وہ بڑی سنجیدگی سے حسن سے ناراض ہو گئی  
 تھی۔ آتنا سامنا ہونے پر وہ اسے نظر انداز کرتی اپنا  
 کوئی کام کرنے میں لگی رہتی۔ اول تو وہ گھر پر ٹلکائی کم  
 تھا اور جو تھوڑا بہت وقت وہ گھر پر ہوتا بھی تھا تو اسے  
 اپنے کام دھندوں سے فرصت نہ تھی کہ اس کی  
 ناراضگی کے اسباب پر غور کرے۔ وہ اس کی بے نیازی پر  
 کھول کر رہ جاتی۔ دوڑھائی ماہ جاری رہنے والی اس یک  
 طرفہ ناراضگی کا اختتام بھی اسے سابقہ روایت کو برقرار  
 رکھتے ہوئے خود ہی کرنا پڑ گیا۔  
 صبا بھابی اپنی کسی رشتے دار خاتون کے ساتھ ان  
 کے گھر آئیں اور رازداری میں اماں کو بتایا کہ وہ فاطمہ  
 کے لیے رشتہ لاتی ہیں۔ یہ خاتون ان کی کوئی دور کی  
 عزیزہ ہیں اور ان کا بیٹا بی کام کر کے ”سولی سدرن“  
 میں جاب کرتا تھا۔

”میں نے فاطمہ کی خوب تعریفیں کیں تو وہ یہاں  
 آنے کے لیے بے تاب ہو گئیں۔“  
 اماں بھابی کی بات پر مسکرا دیں اور پولیس ”سپلے  
 مجھ سے پوچھ تو لیتیں۔ اپنی رائی کو تو میں بھی خود سے  
 جدا نہیں کروں گی۔ وہ ہمیشہ میرے پاس رہے گی۔“  
 اماں کی بات سمجھتے ہوئے صبا بھابی بھی ہنس پڑیں  
 اور پولیس ”بڑی چالاک ہیں آئی آپ۔ چپکے چپکے ہو  
 پسند بھی کر لی اور ہمیں بتایا بھی نہیں۔“  
 وہ جو چاہئے لے کر اندر آنے والی تھی ان لوگوں کی  
 معنی خیز گفتگو سن کر پرک گئی۔ یہ تمام باتیں سن کر اسے  
 عجیب سی خوشی ہوئی تھی۔  
 رات کھانے کے دوران اماں حسن سے پولیس  
 ”سچ صبا اپنی کسی جاننے والی کے ساتھ فاطمہ کے لیے  
 پروپونل لاتی تھی۔“ وہ حسن کے سامنے اس ذکر پر  
 جھینپ گئی۔ حسن نے پانی پیتے ہوئے ایک نظر اس  
 کے شرم سے سرخ ہونے پر ڈالی پھر اماں کی  
 طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ شاید ابھی ان کی بات کے جواب  
 میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فون کی تیل بجتے لگی۔ وہ تو  
 پہلے ہی وہاں سے اٹھنے کا بہانا تلاش کر رہی تھی۔  
 فوراً اٹھ گئی۔ اتفاق سے فون تھا بھی اس کا۔ اس  
 منٹ بعد وہ فون سن کر واپس آئی تو دروازے پر ہی رک  
 گئی۔ اندریات ہی کچھ اس قسم کی ہو رہی تھی۔ حسن  
 اماں سے کہہ رہا تھا۔  
 ”پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اسے صرف اور صرف  
 ایک کزن سمجھتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری  
 زندگی کی Priorities (ترجیحات) میں شادی سب  
 سے آخری نمبر پر ہے۔ مجھے ابھی اپنا کیریئر بنانا ہے  
 خود کو اسٹیبلش کرنا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ میں  
 ساری زندگی اس جاب پر اکتفا کر کے کنویں کا مینڈک  
 بن کر گزار دوں۔“  
 اس کے صاف اور دو ٹوک جواب پر اماں کچھ  
 بایوس سی ہو کر پولیس ”خالی مکتفی کی بات کی کرنے میں  
 کیا یہ اتنی ہے۔ شادی انسان کو ترقی کرنے سے روکتی  
 رہتی۔ تمہارے اپنے بابا کی مثال تمہارے ساتھ

جس نے سادگی کے بعد انہوں نے ڈاکٹر بن گیا  
 اس کے علاوہ بھی وہ ساری زندگی علمی اور تحقیقی  
 کاموں میں مصروف رہے۔ کب میں ان کے راستے  
 کی راکٹ بنی۔ بلکہ وہ تو اتنا مجھے اپنی ترقی اور کامیابی کا  
 پیچاس فیصد حصہ دار قرار دیتے تھے۔ خود میں نے بھی تو  
 شادی کے بعد تعلیم مکمل کی۔“  
 ”ضروری تو نہیں جو آپ نے کیا وہ میں بھی کروں  
 اور ویسے بھی میں بابا جتنا جیسٹس نہیں ہوں۔ میں  
 ایک وقت میں ایک طرف اپنی توجہ رکھ سکتا ہوں۔  
 مجھے ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ میرے فیوچر  
 پلانز مجھے آئندہ پانچ چھ سال تک شادی کی اجازت  
 نہیں دیتے۔“  
 اس کی بات پر شاید اماں نے کچھ اور بھی کہا ہو مگر وہ  
 سننے بغیر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنے رویے کے جانے پر وہ  
 بہت بری طرح اسلٹ محسوس کر رہی تھی۔ مگر وہ یہ  
 بھی نہیں چاہتی تھی کہ اماں یا حسن کو اس بات کی خبر  
 ہو کہ وہ ان لوگوں کی باتیں سن چکی ہے اس لیے اس  
 نے اپنا رویہ معمول کے مطابق رکھا۔ حسن سے بھی  
 بڑے غام سے انداز میں بات کر سکی۔ گویا اسے وہ اس  
 بات پر سخت شکی تھی لیکن اسے اپنا بھرم بہت عزیز  
 تھا۔  
 حسن کو ایک ملٹی نیشنل میں بہت اچھی پوسٹ آفر  
 ہوئی تو اس نے جوائن کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ پہلے  
 دو تین جگہ ہاتھ پاؤں مار کر وہ جتنا کما تا تھا۔ اب ایک  
 ہی جگہ کام کر کے وہ اس سے بہتر تنخواہ پارہا تھا۔ انٹرنی  
 ٹیوٹ جانے کی تو اب کوئی ضرورت باقی نہ رہی تھی سو  
 شام اب اس کے پاس فارغ تھی۔ اس فراغت کا فائدہ  
 اٹھا کر اس نے این ای ڈی یونیورسٹی کے ایوننگ  
 پروگرام میں ایم سی ایس میں ایڈمیشن لے لیا۔ اس  
 کے اس اقدام سے اماں سب سے زیادہ خوش ہوئی  
 تھیں۔ بیٹا کامیابوں کا سفر طے کر رہا تھا اس کی جانب  
 میں بھی اس کی لیاقت اور ذہانت کے ڈنگے پٹ رہے  
 تھے ان کا سر خمر سے بلند تھا۔  
 اماں سیٹلائٹ چینلز اور وی سی آر کی پکی دشمن

تھیں اس لیے اس قسم کی کوئی چیز ان کے گھر موجود نہ  
 تھی۔ اس بارے میں ان کا کہنا تھا ”ایک طرف تو ہم  
 لوگ انڈیا کو اپنا سب سے بڑا دشمن کہتے ہیں اور  
 دوسری طرف ان کے ٹی وی پروگرام اور فلمیں دیکھتے  
 ہیں۔ جس کسی کے بھی گھر میں ڈش بکس کی آڑے وہ  
 انڈین پروگراموں کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتا۔  
 ہمارے قول اور فعل کے اسی تضاد کی وجہ سے ہم آج  
 تک کشمیر آزاد نہیں کروا سکے۔ جب ہم ان سے ثقافتی  
 جنگ ہار گئے تو کسی اور میدان میں کیا لڑ سکیں گے۔“  
 اس کی دو تئیں فلموں وغیرہ کی باتیں کرتیں تو وہ  
 خاموشی سے ان کا منہ دیکھتی رہتی۔  
 اس روز نغمہ نے اسے ایک انگشٹ فلم کی سی ڈی  
 دے دی اور پوچھی۔  
 ”بڑی اچھی مووی ہے۔ اسے دیکھنے سے تو تمہاری  
 اماں بھی متع نہیں کریں گی۔ انہیں تو صرف انڈین  
 فلمیں ٹاپند ہیں۔“  
 اس نے فلم کی بہت تعریف کی تو اس کا بھی دیکھنے کو  
 دل چاہنے لگا۔ چنانچہ اس سے سی ڈی لے لی۔ حسن کی  
 اجازت کے بغیر وہ کمپیوٹر میں گھسنا نہیں چاہتی تھی اور  
 ویسے بھی اسے کمپیوٹر کے بارے میں کچھ معلومات نہ  
 تھیں اس لیے اس نے اس کی واپسی کا انتظار کیا۔  
 رات کھانے کے بعد وہ اس کے کمرے میں آئی تو وہ بیل  
 پر ٹانگیں پھیلانے کسی سے فون پر محو گفتگو تھا۔  
 ”میں تو بارڈر ویز انجینئر اسے مانتا ہوں جو کسی چیز کو  
 ری ٹیڈس کرنے کے بجائے رہ پٹر کرے۔ تم دیکھنا“  
 میں یہ چیلنج جیت جاؤں گا۔ اگر میں نے بارڈر ویز  
 رہ پٹر نہ کر دی تو میرا نام بدل دینا۔“  
 وہ بڑے زور و شور سے بلند بانگ دعوے کر رہا تھا۔  
 اسی وقت اس کی نظر اپنے سامنے کھڑی فاطمہ پر پڑی تو  
 اس نے جلدی جلدی اپنی بات ختم کر کے فون رکھ دیا  
 اور اس سے بولا۔  
 ”کیا بات ہے کوئی کام ہے؟“  
 ”میں اپنی فرینڈ سے یہ مووی لاتی ہوں۔“ اس نے  
 سی ڈی اس کے سامنے کی تو وہ ایک لمحے کو تونہ دھننے



”حسن! میرا وقت آیا ہے۔ دیکھو! میرے بعد میری بیٹی کا خیال رکھنا۔ اگر اسے کوئی تکلیف پہنچی تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

ان کی اس بات پر وہ رونے لگی اور زندگی میں پہلی مرتبہ اماں نے اس کے رونے پر کوئی توجہ نہ دی اور بدستور حسن کے ہاتھ پکڑے ہوئے گئیں۔

”تم مجھ سے وعدہ کرو۔ رانی کا خیال رکھو گے۔ اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑو گے۔ اگر اسے کوئی دکھ پہنچا تو میں روز حشر صغیر کو کیا منہ دکھاؤں گی۔“ حسن نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہ ضدی لہجے میں بولیں۔

”نہیں۔ تم مجھ سے وعدہ کرو۔ میں اپنی بیٹی تمہارے سپرد کر کے جا رہی ہوں۔“ پھر اس کے وعدہ کرنے پر انہوں نے کمری طمانیت بھری سانس لی اور بولیں۔

”اپنا وعدہ ایفا کرنا۔ اسے کبھی شرمندہ نہ ہونے دینا۔“

اس رات بھی روز کی طرح وہ ان کے برابر سوئی تھی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو اماں بے خبر سو رہی تھیں۔ روز فجر میں اسے اماں ہی جگایا کرتی تھیں۔ آج اماں نے نہیں اٹھایا تو وہ اٹھ کر بے تک سوئی رہی تھی۔ وہ انہیں توازو سے کراٹھانے لگی۔ اس کے بعد انہیں ہنسنے لگا۔ وہ سر اسیٹنگی کے عالم میں بھاگتی ہوئی حسن کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے حواس باختہ اور پریشان دیکھا تو اس سے کچھ پوچھے بغیر ہی بھاگتا ہوا نیچے آیا۔ اماں کو آکر قریب سے دیکھا۔ وہ چار آوازیں دس اور پھر فوراً ہی قریب ترین کھینک سے ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ ڈاکٹر نے آکر ان کے بدترین خدشات کی تصدیق کی تو اس کے منہ سے ایک ٹھنکی ٹھنکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ شاید تیوراً کر زمین پر گرنے والی تھی جب حسن نے اس کو سنبھالا تھا اور شاید گلے سے لگا کر کچھ کہا بھی تھا مگر وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

تین دن تک وہ آنکھ سے ایک بھی آنسو پکائے بغیر

”یہ دیکھو!“ اسے ساؤنڈ کارڈ کہتے ہیں۔“

وہ خاموشی سے کھڑی اسے ساؤنڈ کارڈ لگا تا دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس نے مانیٹر کے دائیں بائیں دو اسکرین پر دیکھا اور پھر پوسٹ میں ان کے تار لگائے۔

”میں سی ڈی لے کر آؤں۔“ وہ بڑے مصروف انداز میں بولا ”ہاں لے آؤ۔ ویسے ابھی تو میں ساؤنڈ کارڈ Detect (ڈیٹیکٹ) کروا رہا ہوں۔“ اس کی ہونق شکل پر اس کی نظر پڑی تو ہنسنے ہوئے بولا۔

”Detect کا مطلب پتا ہے؟“ وہ اپنا مذاق اڑائے جانے پر کچھ ناراض سی ہوئی تو وہ بولا۔

”تم تو میرا نام ڈیو او کی۔ اچھا یہ بتاؤ ہارڈ ویئر کسے کہتے ہیں اور سافٹ ویئر کسے؟“ کمپیوٹر میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ سیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے بڑی بے زاری شکل بنائے کھڑی رہی۔

جبکہ وہ اسے سکھانے پر بند۔ وہ بہترین کمپیوٹر پروگرامر ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کی دنیا کا بے تاج بادشاہ۔ پتا نہیں کون کون سی لینگویج جس کے گھر کی باندیاں تھیں۔ اس کی اپنی کزن کا یہ حال اسے چراغ تلے اندھیرے کے مترادف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر جب مقابل کچھ کیسے پر ہی آمادہ نہ ہو تو پھر فائدہ کیا۔

اس لیے سوال جواب کا پروگرام ملتوی کر کے سی ڈی اس کے ہاتھ سے لے لی اور اسے سمجھانے لگا کہ کیسے کمپیوٹر آن کر کے سی ڈی لگانی ہے۔

”ابھی تو مجھے اپنا کچھ کام کرنا ہے۔ تم کل یہ فلم دیکھ لینا اور اس کے علاوہ بھی کبھی کوئی فلم دیکھنی ہو یا کوئی اور کام ہو تم آرام سے میرا کمپیوٹر استعمال کر سکتی ہو۔“

اس کی عنایتوں پر سرشار سی وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ اسے لگا وہ خاص طور پر اسی کے لیے ساؤنڈ کارڈ وغیرہ لایا ہے۔ اس کی جانب سے اپنائیت کا یہ اظہار اسے بے طرح خوش کر گیا تھا۔ اس کا خوش قسم دل دوبارہ سے ہڈی فضول سی باتیں سوچنے لگا تھا۔

بی ایس سی کرنے کے بعد وہ آرام سے گھر بیٹھ گئی۔ اماں نے ایک آدھ بار سرسری سا اسے آگے پڑھنے

والے انداز میں اسے دیکھا رہا۔ پھر اس کے بعد مسکرا کر بولا۔

”اچھا تو تمہیں کمپیوٹر پر یہ مہووی دیکھنی ہے۔“

اس کی بات پر اس نے انہماک میں سر ہلایا تو وہ قدرے افسوس بھرے لہجے میں بولا ”لیکن تم دیکھو کیسے۔ اصل میں میرے پاس ساؤنڈ کارڈ نہیں ہے۔“

”یہ ساؤنڈ کارڈ کیا بلا ہے۔ وہ جانتی نہ تھی۔ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر وہ بولا۔

”میرا مطلب ہے گوئی فلم کیسے دیکھو گی۔ آواز کے بغیر کیا منہ آئے گا؟“ وہ اس کے تاثرات سے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس لیے فوراً ہی وضاحت کے ساتھ سمجھایا تھا۔ اس کی بات پر وہ کچھ مایوس سی اپنے کمرے میں لوٹ آئی تھی۔ نقد نے فلم کے اتنے قصیدے پڑھے تھے کہ اس کا دیکھنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔

اگلے روز کھانے کی میز پر وہ اس سے بولا ”تم نے اپنی دوست کو سی ڈی واپس تو تمہیں کی؟“

وہ اس کے سوال پر کچھ حیران ہوئی ہوئی بولی ”نہیں“ آج کل تو چٹھیاں ہیں تب چٹھیوں کے بعد ہی واپس کروں گی۔“

کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اس نے کہا ”ایک کپ گرم گرام مزے دار سی چائے کالے کر جلدی سے میرے کمرے میں آؤ۔“

چائے لے کر وہ اس کے کمرے میں آئی تو وہ کمپیوٹر کی ٹیبل کے سامنے ہی کھڑا ہوا تھا۔ اسے آمادہ دیکھ کر بولا۔

”یہ دیکھو۔ بھلا بتاؤ اسے کیا کہتے ہیں؟“ اس نے دو تین ڈبے اس کے سامنے کیے۔ پھر اس کے جواب دینے سے پہلے خود ہی کہنے لگا

”بہت دنوں سے اپنے کمپیوٹر میں ساؤنڈ کارڈ کا اضافہ کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ میں نے سوچا چلو تمہارا بھی بھلا ہو جائے گا“ آج ہی خرید لوں۔“

وہ اس سے باتیں کرتا پھر دوسری طرف متوجہ ہو گیا اور ایک عجیب الحاحت سی شے اس کے سامنے کرتا



سکتے کی کیفیت میں رہی۔ سب اسے رولانے کی کوشش کر چکے تھے مگر وہ چپ چاپ بیٹھی غلاؤں میں گھورتی رہتی۔ تیسرے دن ذکیہ آنٹی اس کے پاس آئیں اور اس کے بالوں میں بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

”بیٹا! تم نے اتنے دنوں سے کچھ کھایا نہیں ہے۔ لو یہ ذرا سا دودھ پی لو۔“ وہ دودھ کا گلاس اس کے آگے کرتے ہوئے بولیں تو اس کی سوئی ہوئی حیات بیدار ہو گئیں۔ اماں اسے زبردستی دودھ پلا رہی تھیں اور وہ سینے میں نخرے دکھا رہی تھی کوئی منظر اس کی نگاہوں کے سامنے نہ آنے لگا تو وہ گلاس ان کے ہاتھ سے جھٹکتے ہوئے چیخ کر بولی۔

”میری اماں کہاں ہیں۔ میں دودھ ان کے ہاتھ سے پیتی ہوں۔ آپ کو پتا نہیں ہے کیا؟“ وہ دیوانہ وار اٹھ کر بھاگی اور اپنے کمرے میں آکر آوازیں دینے لگی۔

”اماں! کہاں ہیں آپ جلدی آئیں۔“ اس کی اس حالت پر سب ہی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں جبکہ وہ اب چیخ کر رو رہی تھی۔

”میری اماں کو لاؤ۔ میں سوؤں گی کس کے پاس“ مجھے اب پیار کون کرے گا“ مجھے رات کو دودھ کون پلائے گا۔“

پھر جو وہ روئی تو اپنے ساتھ سب ہی کو لائیں تھی۔ حسن دروازے میں کھڑا غم آنکھوں سے اسے روتا بلکتا دیکھ رہا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

صبح نو بجے وہ سو کر اٹھا۔ نماز کر کے سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ اسے رات جس جگہ اور جس زاویہ سے بیٹھا چھوڑ کر گیا تھا وہ ابھی تک اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے قدموں کی چاپ پر فاطمہ نے نظریں گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم رات بھر یہیں بیٹھی رہی ہو۔ اوہ مائی گاؤ! وہ پریشانی سے بولا۔ کچھ دیر اس کے چہرے کو بغور جانچتا رہا پھر دوبارہ بولا۔

”جاؤ منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ میں ناشتہ لگاتا ہوں۔“

وہ کسی روٹ کی طرح اٹھی اور منہ دھو کر پانی پی گئی۔ واپس آئی تو وہ ٹیبل پر بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اس کے لیے سلائس پر مکھن لگا کر دیا جسے اس نے خاموشی سے کچڑ لیا۔ وہ اس کے ابڑے اور ویران چہرے سے نظریں ہٹا کر بڑے عام سے انداز میں بولا۔

”لگتا ہے رات بھر تم نے کوئی پیکنگ کی نہیں ہے۔ اب ایسا کرو ناشتے کے بعد اپنے کپڑے وغیرہ اور جو ضروری چیزیں ہیں انہیں پیک کرو۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تمہیں بھی تین چار گھنٹے تو لگیں گے ہی۔“

”میں کیس نہیں جاؤں گی۔ مجھے یہیں رہنا ہے۔“ وہ بے چین ہو کر بولی۔

”فاطمہ! مجھے کی کوشش کرو۔ تم اب یہاں نہیں رہ سکتیں۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”کیوں نہیں رہ سکتی۔ یہ میرا گھر ہے۔ مجھے یہاں سے کون نکال سکتا ہے۔“ وہ ناراضی سے بولی۔

”کوئی تمہیں نکال نہیں رہا۔ بھئی لوگ کسی وجہ سے اپنا گھر چھوڑ کر ہوٹل میں نہیں رہتے کیا؟“ کتنی ساری لڑکیاں پڑھنے کے لیے یا نوکری کے لیے دوسرے شہروں میں آکر ہوٹلوں میں رہتی ہیں۔ وہ بھی تو اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہیں۔“ وہ بڑے پیار سے اسے سمجھا رہا تھا مگر وہ ایسی کوئی بات سمجھتا نہیں چاہتی تھی اس لیے سابقہ ٹون پر قرار رکھتے ہوئے بولی۔

”میں ان کی طرح نہیں ہوں۔ مجھے اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جانا۔“

”میں جب تک آؤں۔ تم سامان بیک کر لینا۔ اب مزید میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔“

وہ نرجس ہو گیا تو تمام لحاظ اور مروت بالائے طاق رکھتا درشتی سے کہہ کر گھر سے چلا گیا۔ اس سے تو تین چار گھنٹوں کا کہہ کر گیا تھا مگر پریشانی میں ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی واپس آ گیا۔ اس کے کمرے میں آکر دیکھا تو وہ آنسو برسائی سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھ رہی تھی۔ اس وقت کسی بھی قسم کی نرمی یا محبت کا اظہار اسے

منکار پڑ سکتا تھا اس لیے اس کے رونے کی پروا کیے بغیر بولا۔

”میں اپنے کمرے میں ہوں۔ پیکنگ ہو جائے تو مجھے بتاؤ۔“

شام کے چار بجے وہ اس کے ساتھ باہر نکلی تو اس کا دل چاہا ایک بار اس گھر کی دیواروں سے لپٹ کر خوب روئے۔ اپنے کمرے ’لاؤنچ‘ کچن اور گھر کے ایک ایک کونے کو حسرت سے دیکھتی وہ اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ حسن کو آفس کی طرف سے گاڑی ملی ہوئی تھی۔ مگر آفس آنے جانے کے علاوہ وہ اسے استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس لیے باہر کھڑی بلو کیب میں اس کا سامان رکھنے لگا۔ جب تک ٹیکسی فلی سے نکل نہیں گئی وہ گروں موڑے اپنے گھر کو دیکھتی رہی۔ وہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے حسن کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا۔

”جعفر کی دور پرے کی رشتے دار ہیں مسز کاظمی۔ بہت اچھا اور صاف ستھرا ہاسٹل ہے۔ گھر میں تو تم بوری ہوئی تھیں۔ وہاں اتنی ساری لڑکیاں ہوں گی۔ تمہیں اتنی اچھی مہینی ملے گی اور کتنا تھوڑے ہی دنوں بعد مجھ سے کوئی میرا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔“ وہ اسے بہلا رہا تھا اور فاطمہ اپنے آنسو پتی چپ بیٹھی تھی۔

گلستان جو ہر کے صاف ستھرے علاقے میں واقعی وہ ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ وہ حسن کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ سامنے کا پارکنگ اور اس کے ساتھ ہی لائن تھا جس میں دیدہ زیب پھول پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اصل عمارت اس کے پیچھے تھی۔ وہاں کے انٹری پر بہت محنت کی گئی تھی۔ کو ریڈیو میں انڈور پلانٹس اور خوبصورت پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ مسز کاظمی کے شاندار آفس میں ان کی میز کے سامنے وہ حسن کے براہروی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

”آئی! یہ میری کزن ہے فاطمہ عارف۔ اور اب آپ کو اس کا خیال رکھنا ہے۔“ وہ سامنے بیٹھی ساتھ بیٹھ کر سالہ کرپس فل سی خاتون سے مخاطب تھا۔

”تم فخر مت کرو۔ میں اپنے ہاں موجود تمام بچیوں

کو اپنی بیٹیوں ہی کی طرح سمجھتی ہوں۔“ وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے اور وہ چپ بیٹھی میز کو گھور رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر جانے لگا تو وہ بھی بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو؟“ مسز کاظمی نے اسے بڑے پیار سے ٹوکا اور پھر حسن سے بولیں۔

”تم کیوں رک گئے؟ جاؤ۔ یہ یہاں بالکل محفوظ ہے۔“ وہ جو اسے اٹھا دیکھ کر رک گیا تھا۔ انہیں خدا حافظ کہتا وہاں سے چلا گیا۔ اسے ایسا لگا وہ بھری دنیا میں اکیلی کھڑی ہے۔ بالکل تنہا اس کا کوئی نہیں ہے۔

مسز کاظمی پتا نہیں کتنی دیر تک اسے اپنے پاس بٹھائے اور دوسری باتیں کرتی رہیں۔ یہ اچھا سلوک شاید جعفر کی دوستی کی وجہ سے تھا۔ وہ ان کی کوئی بھی بات نہیں سن رہی تھی۔ وہ خود اسے لے کر فرسٹ فلور پر آئیں اور ایک کمرے کا دروازہ کھول کر بولیں۔

”یہ ہے تمہارا کمرہ۔“ پھر کمرے میں موجود ایک لڑکی سے بولیں ”جو یہ! یہ فاطمہ ہے اور اب یہ تمہارے ساتھ اس روم کو شیئر کرے گی۔“

اس لڑکی نے مسکرا کر اسے ہلو کہا۔ اسے کمرے میں بٹھا کر مسز کاظمی چلی گئیں۔ تو وہ لڑکی بڑی دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر جاتے اس سے پوچھنے لگی۔

”چائے پیو گی؟“ پھر خود ہی کہنے لگی۔ ”جی“ آج تمہارا پہلا دن ہے اس لیے تم میری مہمان ہو اور ہو سکتا ہے تم تکلف میں متغ کرو۔ اس لیے میں چائے لے بی آئی ہوں۔“

پھر چائے پینے کے دوران اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس نے Mass Communication (ابلاغ عامہ) میں ماسٹر کر رکھا ہے اور آج کل ایک انگریزی روزنامے کی میگزین انچارج ہے۔ وہ یہاں کیوں رہ رہی ہے یا اس کا گھر کہاں ہے اس بارے میں اس نے کچھ نہیں بتایا اور وہ تو اس وقت پتا نہیں



بیٹھی ہوئی کیسے تھی۔ اس لیے اس کی تمام باتیں بڑی غیر دلچسپی سے سن رہی تھی۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ اپنے بارے میں سب بتا کر اس نے اس سے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا تھا یا شاید وہ اس کے خود سے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ چائے پی کر وہ اس سے معذرت کرتے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں کہنی دیتی۔ لیکن مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ انشا اللہ واپسی پر ڈھیروں باتیں ہوں گی۔“

اس کے جانے کے بعد وہ تھکے تھکے انداز میں بستر پر گر گئی۔ کمرہ خاصا کھلا اور ہوا دار تھا۔ دو سنگل بیڈز جن کے درمیان میں ایک چھوٹی سی خوبصورت میز رکھی ہوئی تھی۔ سامنے ایک صوفہ تھا۔ کارنر پر رائٹنگ میبل رکھی ہوئی تھی۔ سامنے بڑی سی لکڑی کی الماری تھی۔ اچھے قیمتی کپڑے کے پردے کھڑکیوں پر پڑے تھے۔ وہ وہاں کی خوبصورتیوں سے بے نیاز اپنی حماں انیسویں پر ماتم کر رہی تھی۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیک رہا تھا۔

وہ روتے روتے بتا نہیں کب سو گئی تھی۔ صبح اس کی آنکھ جویریہ کے جگانے پر کھلی وہ اس کے پاس کھڑی کمرہ رہی تھی۔

”فائل! تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔ نیچے وزیٹرز روم میں۔“ اس کی بات سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی اور پھر نیچے آگئی۔ وہاں کی دیگر جگہوں کی طرح وزیٹرز روم بھی خاصا بڑا اور ویل ڈیکور بیڈ تھا۔ سامنے صوفے پر حسن بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

”کیسی ہو؟“ وہ سلام کر کے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تو اس نے اس کے روتے روتے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ اس کے علاوہ کمرہ بھی کیا سکتی تھی۔ اس کے مایوسی بھرے انداز پر وہ اٹھ کر اس کے برابر میں آکر بیٹھ گیا اور نرم لہجے میں کہنے لگا۔

”تم پلیز اپنے اندر تھوڑی ہمت پیدا کرو۔ اتنی

مایوسی اچھی بات نہیں ہے۔ اور پھر تم اکیلی تو نہیں ہو میں ہوں ناں۔“ اس کی اس بات پر وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں میں اکیلی تو نہیں ہوں۔ تمام رشتے کنوا کر بھی ابھی یہ ایک واحد غمی رشتہ تو میرے پاس ہے۔ یہ میرا اپنا ہے۔ میرا غم گسار۔ میں اتنی دل گرفتہ کیوں ہو رہی ہوں۔“ اپنے رات بھر کے مایوس کن خیالات اس نے لمحے بھر میں رو کر بے اور قدرے رُسکون ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے مطمئن انداز پر پُر سکون ہوتا ہوا بولا۔

”کل تو جلدی میں تم سے ساری باتیں بھی نہیں کر سکا تھا۔ یہ میرا آفس کا فون نمبر ہے۔ کوئی بات ہو کوئی مسئلہ ہو فوراً مجھے فون کر دینا۔ میں خود بھی چکر لگاتا رہوں گا۔“ اس نے ایک جٹ پر دو تین نمبر لکھ کر اسے تھمائے اس نے خاموشی سے وہ جٹ لے لی۔

”یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہونے لگیں گے تو میں تمہیں فارم لا دوں گا۔ بس تم پریشان مت ہونا۔“ وہ دوبارہ اسے تسلی دینے لگا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اسے کچھ نوٹ تھمائے۔ ”یہ پیسے رکھ لو اور کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ؟“

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پیسے لے لیے۔ کل کے مقابلے میں آج وہ خود کو خاصا بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ہاسٹل میں آہستہ آہستہ سناٹا پھیلنا جا رہا تھا۔

تمام لڑکیاں اور خواتین اپنے اپنے تعلیمی اداروں یا آفسز جا چکی تھیں۔

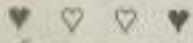
مسز کاظمی مقامی گریڈ کالج کی ریٹائرڈ پرنسپل تھیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اکیلا گھر انہیں کٹ کھانے کو دوڑنے لگا کہ ان کے تین بیٹے امریکہ کی مختلف ریاستوں میں پڑھنے کی غرض سے جانے کے بعد اب مستقل وہیں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی اور ان کے شوہر خاصے اثر و رسوخ والے آدمی تھے۔ چنانچہ انہوں نے دو سال پیشتر اس گریڈ ہاسٹل کا آغاز کیا۔ اس ہاسٹل کی تعمیر اور تزئین

اور فرش میں انہوں نے خاصا پیسہ صرف کیا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر ان کے اپنے آفس کے علاوہ اکاؤنٹس سیکشن اور دیگر انتظامی دفاتر کے علاوہ رہائشی کمرے بھی تھے۔ تینوں فلورز کے اپنے اپنے ڈائمنگ ہالز اور سنگ رومز تھے۔ سنگ روم میں موجود فی وی پر غیر ملکی چھٹلا بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ وہیں بڑا سا بک شافٹ موجود تھا جس میں مختلف اخبارات اور میگزینز رکھے رہتے تھے۔ لڑکیوں کا زیادہ وقت رات میں وہیں گزرا کرتا تھا۔

ہر فلور پر ایک کچن بھی تھا۔ تینوں وقت ناشتہ اور کھانا بھی عمدہ اور معیاری ہوتا۔ لڑکیاں چاہتیں تو ڈائمنگ روم میں کھانا کھاتیں نہیں تو اپنے کمرے میں منگوا سکتی تھیں۔ روزانہ کمرے کی صفائی اور ہاتھ روم دھونے کے لیے ماسی بغیر تانے کے آتی۔ ہاتھ رومز بھی صاف ستھرے ٹائلز اور ٹب والے تھے۔ اتنی ساری سہولیات وہ ایسے ہی تو فراہم نہیں کر رہی تھیں وہاں کے چار جز عام ہو سٹل کے مقابلے میں کافی زیادہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں رہائش پذیر لڑکیاں اور خواتین اچھے کھاتے مٹے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ مسز کاظمی کا گھر ہاسٹل کے برابر ہی تھا۔ اس لیے وہ کچھ وقت یہاں اور کچھ اپنے گھر میں گزارا کرتیں۔

ان کی غیر موجودگی میں مسز ہاشمی وہاں کی انچارج بن جاتیں۔ دونوں خواتین وہاں رہنے والی لڑکیوں پر کڑی نگاہ رکھا کرتیں۔ رات نو بجے کے بعد کہیں بھی آنے جانے پر پابندی تھی اور اگر کبھی کسی کو کسی وجہ سے کہیں جانا ہوتا تو کیا کب کیوں ایسے قسم کے ڈھیروں سوالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مسز کاظمی کا شعبہ جاسوسی خاصا اچھا تھا۔ کسی لڑکی سے اس کے گارجینز کے علاوہ کوئی اور ملنے آتا تو انہیں بتا نہیں کیسے معلوم ہو جاتا اور پھر اس بے چاری کی شامت آجاتی۔ یہ سختی خاص طور پر ان لڑکیوں کے ساتھ تھی جو یہاں پر بھائی کی وجہ سے رہ رہی تھیں۔ ملازمت پیشہ یا بڑی عمر کی خواتین ان کے سوال جواب سے پھر کچھ بچی رہتی تھیں۔ ان کی ان تمام غتوں ہی کی وجہ سے ان کے ادارے کی

ریپوٹیشن بہت اچھی تھی۔ والدین دوسرے شہروں سے اپنی بیٹیوں کو یہاں بھیج کر مطمئن تھے۔ اسے یہاں رہتے تین مہینے ہونے والے تھے۔ وہ صبح میں اکیلی ہوتی تو اپنا سارا وقت قرآن پڑھنے یا سٹیج کرنے میں گزار دیتی۔ سب کچھ بڑھ کر اماں کی روح کو ایصال ثواب پہنچا کر اسے خاصا سکون ملتا تھا۔ حسن ہر اتوار اس کے پاس آتا تو ساتھ ڈھیر ساری چیزیں بھی ہوتیں۔ بھی اس کی پسند کی کوئی کھانے پینے کی چیز کبھی کوئی کتاب یا میگزین۔ اسے وہ چیزیں دے کر دس پندرہ منٹ اس کے پاس بیٹھا اور پھر چلا جاتا۔ ہر مہینے وہ اسے پہلی تاریخ کو تین ہزار روپے دیا کرتا اور ساتھ ہی اس سے یہ بھی پوچھتا۔ ”کچھ اور تو نہیں چاہیے؟“ اس کی ضروریات ہی کیا تھیں چنانچہ وہ انکار کر دیتی۔ اپنے آپ کو اس نئے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرنے کے باوجود ہر رات اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیک جاتا۔ اسے اپنا گھر اور اماں بے طرح یاد آتے۔ ایسے میں جویریہ اس لڑکی کو بڑے دکھ سے دیکھا کرتی جس نے اسے اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور ساری دنیا میں اس کا اپنے ایک کزن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اب تو اس ایک جیسی روئین سے ہزار ہو کر وہ بھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔



رات اس نے خواب میں اماں کو اور اپنے گھر کو دیکھا تھا اور اب سو کر اٹھنے کے بعد سے اس کی عجیب حالت تھی۔ ایک بے کلی سی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اڑ کر اپنے گھر چلی جائے وہاں کے ایک ایک کونے کو چومے اماں کی خوشبو محسوس کرے۔ وہ اپنی اس خواہش کو دبا نہیں پاری تھی۔ چھٹی کا دن تھا جویریہ ناشتے کے بعد اپنی کسی دوست کے گھر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

”جویریہ! تمہاری دوست کا گھر کہاں ہے؟“ وہ اسے تیار ہوتا دیکھ کر پوچھنے لگی تو اس نے لپ اسٹک



لگاتے ہوئے جواب دیا۔

تھی۔ اب وہ ساری دنیا میں کس جگہ کو اپنا گھر کہے گی۔

وہ اس کے تاثرات سے بے نیاز کہنے لگا۔

”تم بیٹھو۔ میں ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔ ویسے اس وقت تمہارا آنا فائدہ مند ثابت ہو گیا ورنہ میں پتا نہیں کب تک پڑا سوتا رہتا۔“ اس کے جانے کے بعد وہاں موجود واحد کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ دل ہی دل میں اس سے ناراض ہو رہی تھی، ”کتنی آسانی سے تم نے ہمارے اس آشیانے کو بیچ دیا۔ تمہیں اس سے کوئی انسیت کوئی محبت نہ تھی۔“ وہ منہ دھو کر واپس آیا تو ہاتھ میں ایک کرسی بھی تھی۔ کرسی اس کے سامنے رکھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”مجھے پیسوں کی ضرورت تھی اور پھر فی الحال یہ گھر میری ضرورت کے لیے بہت زیادہ تھا۔ اس لیے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ اس کا اپارٹمنٹ شیئر کروں گا۔ وہاں شفٹ ہو جاؤں تو تمہیں وہاں کا ایڈریس اور فون نمبر بھی دے دوں گا۔ اچھا یہ بتاؤ تم چائے پیو گی؟“

پھر اس کے جواب دینے سے پہلے ہی اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی گھر کے درودیوار کو تکتی رہی۔

چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں پکڑا کر وہ خود بھی اس کے سامنے بیٹھ کر چائے کے سبب لینے لگا۔ اس کے جلدی جلدی چائے پینے کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے کہیں جانا ہے۔ اس سے مزید کوئی بات کیے بغیر وہ چائے پی کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

”میں کپڑے تبدیل کر کے ابھی آتا ہوں۔“ وہ اس کے عجلت بھرے انداز پر کچھ بے مزہ سی ہو گئی تھی۔ اس کا تو خیال تھا کہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو جائے گا۔ وہ دونوں ڈھیر ساری باتیں کریں گے اپنی اور اماں کی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا پکا کر کھلائے گی۔ مگر وہ اس کے تمام اندازوں کو غلط ثابت کر رہا تھا۔

کپڑے بدل کر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پیے پکڑا ہوا بولا۔

”گلابرگ کی سائیڈ پر ہے۔ کیوں؟“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ مجھے اپنے گھر جانا ہے۔“ وہ ایک دم بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے گردن ہلانے کی دیر تھی وہ جلدی سے کپڑے بدل کر تیار ہو گئی۔ رکشے میں بیٹھی وہ اپنے گھر پہنچنے کی خوشی میں جویریہ سے اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی تھی۔ وہ اس کا جوش و خروش دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ اسے اس کے گھر کے سامنے اتار کر ہاتھ ہلاتی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی تو اس نے بیل بجانے کے ساتھ گیٹ بھی خوب زور زور سے پیٹا۔ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ سورج خوب آگ برسا رہا تھا مگر اسے موسم کی تپش یا دھوپ ہرگز بھی پریشان نہیں کر رہی تھی۔

کتنی دیر تک بیل بجانے کے بعد بھی جب گیٹ نہ کھلا تو اس نے بیل پر ہاتھ رکھ کر اسے مسلسل بجنے دیا۔ اسی وقت گیٹ کھلا۔ نیند سے بوجھل سرخ آنکھوں سے جمہا ہی روکتا وہ پتا نہیں گیٹ پر کس کی موجودگی کی توقع کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”تم!“ حیرانی میں اس کے منہ سے صرف یہی نکل سکا۔ وہ اس کی حیرت سے بے نیاز اپنے گھر کے درودیوار کو محبت سے تکتی رہی تھی۔

”کیلی آئی ہو؟“ وہ اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیتا ہوا بولا تو اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔

”نہیں۔ جویریہ میری روم میٹ مجھے یہاں چھوڑ کر گئی ہے۔“ اسے جواب دیتی وہ اس سے پہلے ہی اندر آگئی۔ تو اندر خالی گھر کو دیکھ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”گھر کا سارا سامان کہاں گیا؟“ لاؤنج پورا خالی پڑا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم میں بھی سارا فرنیچر غائب تھا۔

”میں نے گھر بیچ دیا ہے۔ پندرہ تارخ کو نئے لوگ یہاں آجائیں گے۔“

اس کی بات پر وہ صدمے سے گنگ رہ گئی۔ اس کا پیارا گھر یک گیا تھا اور وہ اس بات سے لاعلم تھی۔ اس نے یہ بات اسے بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی



”تین دن سے آئے کا سوچ رہا تھا۔ مگر ناظم ہی نہیں مل رہا تھا۔ آج شام میں میرا تمہارے پاس آنے کا پکا پروگرام تھا۔“

اس کی اس بات پر فاطمہ کا دل چاہا کہ زمین بھنے اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ اس کے آنے کی کتنی غلطوجہ سمجھ رہا تھا۔ اس نے تو اتنے وقت اس بات پر غور بھی نہیں کیا تھا کہ آج چار تاریخ ہے۔ وہ تو اپنے گھر کی محبت میں دوڑی چلی آئی تھی۔ اس وقت وہ خود اپنی ہی نظروں میں گر رہی تھی۔ کیا وہ اتنی کمبختی اتنی حقیر کہ یوں پیسے مانگنے اس کے در پر چلی آئی تھی۔ ساری زندگی اسی کے دیے پیسے استعمال کیے تھے۔ گو اسے جیب خرچ وغیرہ ملان دیا کرتی تھیں مگر وہ کمائی تو اسی کی ہوتی تھی۔ آج سے پہلے اس نے وہ پیسے اپنا حق سمجھ کر وصول کیے تھے۔ لیکن آج ہاتھ پر دھرے وہ ہزار ہزار کے تین نوٹ اسے زہریلے سانپ لگ رہے تھے۔ جو اسے ڈسنے اس کی طرف بھیہ رہے تھے۔ اسے شاید کہیں جانے کی ہمت ہی جلدی تھی اس لیے پیسے اسے پکڑا کر وہ دوبارہ کمرے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو گھائی پر گھڑی پاندھتا اس سے بولا۔

”چلو“ میں تمہیں چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔“ اسے شاید اس کی اجڑی ویران حالت نظر ہی نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ کے بغیر اس کے پیچھے باہر چلی آئی۔ آتے وقت والا جوش و خروش مفقود تھا۔ واپسی میں اس نے ایک الوداعی نظر بھی اس گھر پر نہ ڈالی۔ جسے وہ آج تک اپنا سمجھتی رہی تھی۔ اس کے پیچھے بانٹیک پر بیٹھی وہ کسی صدمے کے زیر اثر ماحول سے بالکل علی ہوئی تھی۔ راستے میں بانٹیک روک کر اس نے بیکری سے اس کی پسندیدہ کیک بھل کر کچی پیک کروائی۔ اس کے بعد ایوان پیرس سے رس ملائی خریدی۔ جو کسی زمانے میں اس کی من پسند ہوا کرتی تھی۔ بانٹیک ہاسٹل کے سامنے روک کر اس نے دونوں تھیلیاں اس کے ہاتھ میں پکڑائیں اور بڑی جگمگت میں خدا حافظ کہتا ہوا چلا گیا۔ وہ اپنے جو کو بمشکل کھینچ کرے تک نکلی۔

”ہمت اچھا کیا حسن عباس! جو تم نے مجھے میری

اوقات یاد دلا دی۔“

وہ صوفے پر دونوں ہاتھ لٹکائے یوں بیٹھی تھی جیسے اپنا سب کچھ گنوا چکی ہو۔ وہ کمزور تھی بہت کمزور تھی۔ احساس کمتری کا شکار نہیں تھی۔

”اماں کے منہ سے خود کو رانی کہلوا کر میں اپنے آپ کو بچ بچ کر رانی سمجھنے لگی تھی۔ کیا ہوں میں ایک شرابی اور جواری کی بیٹی۔ جس کی ماں بچے والوں کے کپڑے سی سی کر اپنا اور میرا پتہ پالا کرتی تھی اور جسے اس کی اماں ترس کھا کر اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ بے آسرا اور لاوارث سمجھ کر اپنے گھر بنا دے دی تھی۔ ایک ایسی رشتہ دار جس کا نہ کوئی اسکینس تھا اور نہ اسٹینڈرڈ۔ جسے اپنی کزن بتاتے بھی شاید تمہیں شرمندگی ہوتی ہوگی اور اب محض اپنی اماں سے کیے وعدے کی یاداش میں تم اس زبردستی کے رشتے کو نبھانے پر مجبور ہو۔“

اپنی اصلیت اس پر زندگی میں پہلی بار آشکار ہوئی تھی اور خود اپنے ہی لیے یہ سب کچھ سوچتا اسے نہایت اذیت ناک لگ رہا تھا۔

”تمہارے گھر میں رہتے رہتے میں اسے اپنا گھر سمجھنے لگی تھی۔ مجھے اپنا وہ نواب شاہ کا گدا ملا۔ پوسیدہ مکان بھول گیا تھا۔ خود کو تمہارے برابر سمجھنے لگی تھی۔ کیا ہے میری اوقات؟ تمہارے گھروں پر پلی تمہارے در پر بڑی ایک بھکارن جسے تم آج بھی اپنی محنت کی کمائی میں سے خیریت دینے پر مجبور ہو۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ کالی دیر رونے کے بعد جب اس کا دل ذرا ہلکا ہوا تو اپنے آنسو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں دوبارہ اسے مخاطب کیا۔

”لیکن ایک بات تو تم بھول گئے حسن عباس! جس ہستی نے تمہیں عزت نفس، غیرت اور خودی کے معنی سمجھائے تھے۔ میری تربیت بھی انہیں ہاتھوں میں ہوئی ہے اور اب جب کہ میں خواب غفلت سے جاگ چکی ہوں، تمہیں بتا دوں گی میں اپنی بے غیرت بھی نہیں جتنا تم مجھے سمجھتے ہو۔“

وہ ایک عزم اور نئے حوصلے سے کھڑی ہو گئی۔



اگلے روز شام میں چائے پیتے جب اس نے جویریہ سے کوئی جانب دلوانے کی بات کی تو وہ حیران ہو کر کہنے لگی۔

”تمہیں تو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا تھا۔“

”ہاں۔ لیکن اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔“ اس نے لاہوالی سے جواب دیا۔ وہ کچھ دیر اسے حیرت سے دیکھتی رہی پھر کچھ اور پوچھنے بغیر کہنے لگی۔

”تمہاری کوئی نمکینش کیا ہے۔“

”میں نے فی ایس سی کیا ہے۔“

”کچھ کمپیوٹر کے بارے میں نلج ہے۔“ اس کے جواب پر کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا۔

اس نے جواب میں بڑی شرمندگی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا تو وہ فوراً بولی ”آج کل تو معمولی سے معمولی نوکری کے لیے بھی کمپیوٹر لازمی چیز ہے۔ خالی غولی بی ایس سی پر تو تمہیں کسی اسکول ہی میں جانب مل سکتی ہے۔“

وہ اس کی صاف گوئی پر کچھ مایوسی سے ہو گئی تو وہ اس کی بات کو محسوس کر کے کہنے لگی۔

”تم ایسا کیوں نہیں کر لیتیں کسی انٹرنیٹ میں ایڈمیشن لے لو۔ آج کل تو جگہ جگہ کمپیوٹر انٹرنیٹ ٹیوٹ ملے ہوئے ہیں اور جانب کی اگر فوری ضرورت ہے تو اس دوران کسی اسکول میں ملازمت کر لو۔ بعد میں جب تم کمپیوٹر کورس کر لو گی تو کمپنیاں بہتر ملازمت کے لیے کو شش کریں گی۔“

وہ اس کی اس بات پر کچھ مطمئن ہو گئی اور سوچا

”ہاں یہ بہت ستر ہے۔ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔“

اسے ذرا اسی بات کے لیے جویریہ کو پریشان کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر یہ بھی معلوم تھا، کسی اسکول میں ملازمت تلاش کرنا بھی اس کے لیے بڑا مشکل کام ہے مگر اس کے کچھ کے بغیر جویریہ نے اگلے روز خود ہی اسے یہیں قریب ہی واقع ایک اسکول کے بارے میں بتایا۔

”ہے تو چھوٹا سا اسکول، لیکن میرا خیال ہے تمہیں سوٹ کرے گا۔ پیدل چلی جایا کرنا۔“

وہ شاید اس کے ڈر لوگ پن سے واقف ہو چکی تھی اس لیے خود ہی اس کے ساتھ اسکول گئی۔ وہ اس کی بے حد ممنون ہو رہی تھی۔ آج کے خود غرض زمانے میں وہ لڑکی اس کی کون لگتی تھی جو اپنے قیمتی وقت میں اس کے لیے ناظم نکال رہی تھی۔ اسے ملازمت مل جانے کی کوئی خاص امید نہ تھی مگر قدرت یہاں اس پر مہمان ہو گئی تھی۔ بھائی ہزار روپے ماہوار اس پر مہنگائی کے دور میں اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات تھے مگر وہ پھر بھی خوش تھی۔ اسے دوپہر کی شفٹ میں سکس اور سیونٹھ کلاسز کو سائنس اور میٹس پڑھانا تھا۔

اتفاق سے اسی شام حسن اس سے ملنے آیا۔ باسی اسے پیغام دے کر جا چکی تھی اور وہ زندگی میں پہلی بار اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر پھر زبردستی خود کو سمجھا کر اس کے سامنے آئی وہ صوفے پر بیٹھا اسی کی راہ تک رہا تھا۔

”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے عام سے انداز میں جواب دیا۔ اور اس کے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی وہ اپنے کسی بھی انداز سے کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”یہ لہو۔“ اس نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس پر بڑا بڑا لکھا ”یونیورسٹی آف کراچی“ دیکھ کر ہی وہ سمجھ گئی کہ اس میں کیا ہے اس کا خواہ مخواہ ہٹنے کا دل چاہنے لگا۔ وہ اس کی کیفیت سے بے خبر کہہ رہا تھا۔

”تم اسے غل کر کے رکھنا۔ میں کل یا پریوں اگر لے جاؤں گا۔ اپنی مار کس شیٹ وغیرہ بھی مجھے دے دینا۔ میں خود ہی نوٹوں کا پی کر اس میں ایچ کر دوں گا۔“

اس نے لفافہ نہیں پکڑا ”میرا ایڈمیشن لینے کا موڈ نہیں رہا۔ اصل میں ڈیڑھ دو سال سے بڑھائی اور کتابوں سے دور ہوں۔ اب دوبارہ پڑھنے کا دل نہیں چاہ رہا۔ اس لیے میں نے یہیں قریب ایک اسکول میں



جواب کر لی ہے اگلے ہفتے جوائن کر لوں گی۔  
وہ اس کے پر اعتماد انداز پر کچھ دیر سکتے کی کیفیت  
میں اسے دیکھتا رہا۔ جیسے اس بات پر یقین کرنے میں  
اسے تامل ہو۔

”اسکول میں جواب۔۔۔؟“ اس نے کچھ دیر بعد بڑی  
بے یقینی سے دریافت کیا۔ شاید جو سنا تھا اس کی  
تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

”ہاں۔۔۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔  
”لیکن تمہیں پہلے اپنی پڑھائی مکمل کرنی چاہیے۔  
باب وغیرہ اس کے بعد۔“ اس نے اسے سمجھانے کی  
کوشش کی۔

”زبردستی پڑھنے کا فائدہ جب میرا دل ہی نہیں چاہ  
رہا تو فضول میں مغز ماری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔  
پھر اسکول بہت ہی قریب ہے۔ بمشکل دس منٹ کی  
واک ہوئی۔ میں مصروف بھی ہو جاؤں گی اور کوئی  
مشکل بھی نہیں ہوگی۔“

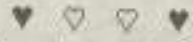
وہ کہنا تو یہ چاہتی تھی تمہیں میرے معاملات میں  
داخلت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو چاہوں گی وہ کروں  
گی۔ مگر آخر اتنے سال اس کے گھر ویاہتوں توڑی  
تھیں اور وہ احسان فراموش یا نمک حرام کہلوانا نہیں  
چاہتی تھی۔ اس لیے اپنا لہجہ غلامانہ ہی رکھا۔ وہ اس  
کے فیصلہ کن انداز پر چپ ہو گیا اور کندھے اچکا کر  
بولی۔

”چھانیر، جیسی تمہاری مرضی۔“  
پھر جب جانے کے لیے کھڑا ہوا تو ایک بڑا سا  
شائنگ بیگ اس کی طرف بڑھایا۔ ”اس میں  
تمہارے لیے کپڑے ہیں۔ مجھے لیڈیز شاپنگ کا کوئی  
تجربہ تو نہیں ہے۔ بس جو سمجھ میں آیا لے لیا۔ شاید  
تمہیں پسند بھی نہیں آئیں۔ لیکن میں نے سوچا۔  
سرویاں شروع ہونے والی ہیں۔ تمہیں گرم کپڑوں کی  
ضرورت ہوگی۔“

وہ اب اس کی دی ہوئی بھیک لینا نہیں چاہتی تھی  
مگر پھر وہی بات نمک اور حق نمک سو بڑے مارل  
انداز میں بولی۔

”میرے پاس بہت کپڑے ہیں۔ ضرورت ہوگی تو  
آپ سے ہی آوں گی۔“  
اس کے جواب پر اس نے بہت چونک کر اسے  
دیکھا جیسے کچھ سمجھنا چاہتا ہو۔  
”آپ تو میں لے آیا ہوں۔ واپس لے جا کر کیا  
کروں گا۔“

تا چار اس نے وہ تھپٹا بڑی بے دلی سے پکڑ لیا۔ یہ  
اور بات کہ اس کے جانے کے بعد بغیر دیکھے وہ جوں کا  
توں کمرہ صاف کرنے والی ماسی کو دے دیا۔ وہ بے چاری  
اتنے سارے قیمتی اور نئے نئے جوڑے دیکھ کر پھولی نہ  
ساری تھی۔ اسے بہت ساری دعا کہیں دے کر اور اس  
کی سخاوت اور دریاہی کے قصیدے پڑھ کر چلی گئی۔  
اس کے بعد ماسی نے اس کے کمرے کی صفائی اور بھی  
دل لگا کر کرنی شروع کر دی تو وہ اس کی معصومیت اور  
سادگی پر بس بس ہی سکی۔



جویریہ ہی کے مشورے پر اس نے پیٹرومین سے  
ایک سال کا فیلپوم لینے کا فیصلہ کیا۔ سامنے والے  
کمرے کی سجدہ وہیں سے لی ایس سی کر رہی تھی۔ وہ  
اسی کے ساتھ وہاں سے پراپیٹکس لینے پہنچ گئی۔  
سجدہ تو اندر اپنی کلاس میں چلی گئی۔ اس نے فارم اور  
پراپیٹکس لیا اور واپس ہاسٹل آئی۔ کتنی عجیب  
بات تھی وہ لڑکی جو اپنی اپنے گھر سے چار قدم کے  
فاصلے پر نہ جاسکتی تھی آج بے گھر اور بے در ہو کر شہر  
کی خاک کتنے آرام سے چھان رہی تھی۔ اب اسے  
اکیلے آنے جانے میں ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔ اور اگر ڈر  
لگتا بھی تو وہ کیا کر سکتی تھی۔ کون تھا جو اس کی پروا  
کرتا۔ وہ اپنے حالات سے گھومنا کرنے کی کوشش  
کر رہی تھی۔ کبھی کسی وقت اگر اپنے حالات سے  
مایوس ہونے لگتی تو سوچتی۔

”میں اکیلی تو ایسے حالات سے نہیں گزر رہی۔ دور  
کیوں جاؤں جویریہ ہی کی مثال میرے سامنے ہے۔  
جس کے والدین نے سولہ سال کی عمر میں اس کی شادی  
کر دی تھی اور پھر شادی کے چار سال بعد اس کے

شوہر نے وہاں سے ہونے کے جرم میں اسے طلاق دے  
دی تھی۔ طلاق کا بد نما داغ لے کر وہ واپس اپنے میکے  
آئی اور خود کو دوبارہ دنیا سے لڑنے کے لیے تیار کرتے  
گئی۔ اپنی اوصوری تعلیم مکمل کی۔ مگر اس کے بھائیوں  
اور بھائیوں کو اس کا وجود گراں گزرنے لگا تو وہ  
خاموشی سے ان کی دنیا سے نکل آئی اور اخبار کے دفتر  
میں نوکری کر کے یہاں رہنے لگی۔ ”مجھے تو صرف یہ  
دکھ ہے کہ میرا کوئی نہیں۔ اس کا دکھ تو مجھ سے نہیں  
زیادہ ہے۔ وہ اپنوں کے ہوتے ہوئے تھا۔ اسی شہر  
میں اس کے چار بھائی اپنے عایدان گھروں میں رہتے  
ہیں۔ اس بات سے بے نیاز کہ ان کی بس ایک ہوٹل  
میں نہایت مشکل زندگی گزار رہی ہے۔ غریب شہر تو وہ  
ہے۔ مجھے اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔“ وہ خود کو  
حوصلہ دیتی۔ اپنے مایوس کن خیالات کو پیچھے  
دھکیلتی۔

ہاسٹل اگر سکون سے بیٹھ کر پراپیٹکس پڑھا تو یہاں  
چلا ہاتھوں سے توتے اڑنے کا محلوہ کیوں اچھا ہوا  
ہے۔ خالی یہ سوچ لینا کہ ہمیں اپنے پاؤں پر خود کھڑا  
ہونا ہے۔ یہ مشکل توڑ دینا ہے۔ وغیرہ جیسی باتیں تو  
صرف ہمارے حکمرانوں کو سوٹ کرتی ہیں۔ خالی خولی  
دعووں سے مشکل نہیں ٹوٹا کرتے۔ اس راہ میں بہت  
کمٹنا پیاں ہیں۔ وہاں کی ہوش ربا فیس واقعتاً اس  
کے ہوش اڑا گئی۔ اب جب کہ وہ اپنی اوقات اچھی  
طرح پہچان چکی تھی۔ اسے پتا تھا حسن ہاسٹل کے چھ  
ماہ کے چار جز ایڈوائس جمع کروا چکا ہے۔ ابھی تو یہ بات  
بھی سوالیہ نشان تھی کہ اس کے بعد وہ یہاں کے  
چار جز کہاں سے دے گی۔ خالی ڈھائی ہزار میں کھائیں  
کے کیا اور پنشن گے کیا ان کے جواب نہیں مل رہے  
تھے۔

”خیر مایوس ہونے سے تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جس  
نے پیدا کیا ہے وہ بھوکا تو نہیں مارے گا۔ اور اگر یہ جگہ  
میں انورڈ نہ کر پائی تو کسی چھوٹے اور گھٹیا سے ہاسٹل  
میں رہنے میں بھی کوئی شرمندگی نہ ہوگی۔“ اپنی یہ  
پیشانی تو وہ جویریہ سے بھی شیر نہیں کر سکتی تھی کہ

اسے اپنی عزت نفس ہر چیز سے زیادہ مقدم تھی۔  
رات بھر سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کے  
اکاؤنٹ میں بڑے ڈیڑھ لاکھ جو شاید ماہانے اس کا  
جیڑ بنانے کے لیے رکھے تھے اسی موقع پر کام آئیں  
گے۔ جب تک وہ کوئی بہتر ملازمت حاصل نہیں  
کر پاتی یہاں کے چار جز اور پیٹرومین کی فیس اسی میں  
سے نکال کر بھروسے کی۔

اپنی اس سوچ پر وہ خود کو شاباش دیتی اسی دن بینک چلی  
آئی بس روٹس جویریہ سے معلوم کر کے وہ اکیلی نکل  
آئی۔ آخر انسان کب تک دوسروں کا سارا  
ڈھونڈے اس طرح تو وہ بھی بہت جلد اس سے تنگ  
آجائے گی۔ زیادہ پیسے نکلاوے ڈر لگ رہا تھا اس لیے  
فی الحال اپنی فیس جمع کروانے کے لیے جتنے چاہیے  
تھے وہ نکلاوے اور واپس آئی۔

اسے پیٹرومین جلتے تیسرا دن تھا۔ جب اس صبح  
حسن چلا آیا۔ وہ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اس  
کی غیر متوقع آمد پر حیران ہوئی وہ پہچنے آئی تو وہ غصے میں  
ادھر سے ادھر نکل رہا تھا۔ اسے سلام کرنے کا موقع  
دیے بغیر وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”اس دن تو فرمایا جا رہا تھا کہ پڑھنے کو دل نہیں  
چاہتا۔ کتابیں زہر لگتی ہیں۔ اب پیٹرومین جانے کا  
شوق اچانک کہاں سے پیدا ہو گیا۔“

وہ اس کے جاسوسی نظار پر حیران رہ گئی۔ یہ تو مسز  
کاظمی سے بھی بڑا جاسوس ہے۔ وہ سر جھکا کر بس یہی  
سوچ سکی۔ جب کہ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے  
اسے ڈانٹ رہا تھا۔

”ایک تو اپنے سوچنے بھٹ ہیں ان سے نمٹوں تو تم  
کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دیا کرو۔“ وہ سر جھکے کھڑی  
تھی اس لیے نہیں کہ اپنی کسی حرکت پر شرمندہ تھی  
بلکہ اس لیے کہ اپنی آنکھوں کی باغیانہ اور سرکش  
کیفیت اس سے چھپانا چاہتی تھی۔

”میں نے سوچا ایم ایس سی کرنے کا کیا فائدہ ہے۔  
پھر آج کل تو کمپیوٹر کی بہت ڈیمنڈ ہے۔“ لہجہ بھی دھیمہ  
سہا تھا۔



”اگر یہی بات تھی تو مجھے نہیں بتا سکتی تھیں جیسے میں یونیورسٹی کے فارم لایا تھا۔ وہاں کے بھی لے آتا۔ مگر تمہیں تو عادت ہے بے وقوفانہ کام کرنے کی۔ دو سروں کو پریشان کرنا شاید تمہیں اچھا لگتا ہے۔“ وہ بدستور کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

اس کے چپ چاپ سر جھکائے کھڑے ہونے پر اسے اور غصہ آ رہا تھا۔

”اب یہ سر جھکا کر کھڑے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے الٹی سیدھی حرکتیں کرو۔ بعد میں شرمندہ ہو۔“

وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اسے کوئی شرمندگی نہیں ہے مگر کہہ نہ سکی۔

”میں بھول گئی تھی۔ آپ سے کہنا یاد نہیں رہا۔“ اگر جو اسے میرے خیالات کا پتا چل جائے تو شاید میرا مذاق ہی اڑائے کہ ہمارے ٹکڑوں پر پٹی آج خود داری اور انا کی باتیں کر رہی ہے۔ وہ اس سے اپنی سوچ کی تبدیلی چھپانا چاہتی تھی۔

”بھول گئی تھیں، واہ کیا بات ہے۔ بھئی اتنی مصروف شخصیت کو یہ چھوٹی موٹی باتیں یاد بھی کہاں رہتی ہوں گی۔“ اب کے لہجہ طنز یہ اختیار کیا گیا تھا۔ پھر اسے گھورنے کے بعد وہ بولا۔

”فیس کے لیے پیسے کہاں سے آئے؟۔ مجھ سے کیوں نہیں کہا۔؟“

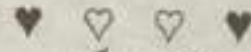
”پیسے میرے پاس جمع تھے۔ وہی بھر دیے۔ اس کے بعد چاہیے ہوں گے تو آپ سے لے لوں گی۔“ پھر وہی نمک و عمرو جیسی بے ہودہ باتیں اسے سنتا رہی تھیں۔

”آئندہ کوئی ایسی حرکت کی تو تمہارا دماغ ٹھیک کروں گا۔ ویسے تم آتی جاتی کیسے ہو؟“ دھمکی دیتے ایک دوسری بات یاد آئی تو لہجہ سوالیہ ہو گیا۔

”وہ میرے روم کے سامنے سعدیہ رہتی ہے۔ وہ وہیں سے بی سی ایس کر رہی ہے۔ اسی کے ساتھ جاتی ہوں۔“

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ کچھ دیر بعد وہ چلا

گیا تو وہ بھی غصے میں ٹھوکی سعدیہ کے ساتھ ہاسٹل سے نکل آئی۔ اس کی باز پرس پر اپنا التجائیہ انداز اسے زہر لگ رہا تھا۔

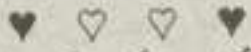


اپنے کمرے سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا شروع ہوا تو اس کی دوستیں بھی بن گئیں۔ ہائے ہیلو تو تقریباً سب ہی سے تھی۔ مگر بالخصوص جویریہ اور اس کا گروپ اسے پسند آیا تھا۔ ان لوگوں نے بھی اسے خندہ پیشانی سے ویلکم کیا تھا۔ ان کے برابر والے کمرے کی فریال انصاری جس کے مئی ڈیڈی اور چھوٹا بھائی جدہ میں رہتے تھے اور وہ انٹر کے بعد مزید تعلیم کے لیے جدہ سے کراچی آ گئی تھی۔ اس کے ڈیڈی رشتے داروں کے گھر رہنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اس لیے وہ ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ رشتے داروں سے ملنے ہر ویک اینڈ پر جایا کرتی تھی۔ وہ بے حد زندہ دل اور ہنسنے ہنسانے والی لڑکی تھی۔ این ای ڈی یونیورسٹی میں آرکیٹیکچر۔ فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ امیر ماں باپ کی تازوں پٹی بیٹی مگر خزانہ نام کو نہیں۔ اس کے ڈیڈی نے اسے یونیورسٹی آنے جانے کے لیے گاڑی تک دلوائی ہوئی تھی۔ اس کے پاس پینٹنم تھری (Panteiem 3) کمپیوٹر بھی تھا اور اس سہولت کا فائدہ فاطمہ کو بہت ہوا تھا۔ وہ انسٹی ٹیوٹ سے جو کچھ سیکھ کر آتی، اس کے کمپیوٹر پر پریکٹس کر لیا کرتی۔ خود فریال کے لیے کمپیوٹر کا واحد مصرف اپنے چھوٹے بھائی سے چیننگ یا ممی اور جدہ کی فرینڈز کو ای میل کرنا تھا۔ اس کی اس بات پر سب ہی اس سے کہتے ”اس کام کے لیے تو کوئی دس پندرہ ہزار کا معمولی گھے پئے ماڈل کا کمپیوٹر بھی کافی تھا۔ کیوں پینٹنم تھری کو بدنام کر رہی ہو۔“ وہ ہنس دیا کرتی۔

گراؤنڈ فلور کی عائنہ سومرو اور عظمیٰ کیانی جو روم میٹس تھیں۔ وہ بھی اسی گروپ کا حصہ تھیں۔ عائنہ۔ حیدر آباد کی رہنے والی تھی۔ اس کے بابا سائیں بہت بڑے وڈیرے ہونے کے باوجود تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ اس لیے خاندان کی مخالفت مول

لے کر بیٹی کو میڈیکل کی تعلیم دلوا رہے تھے۔ وہ ڈی ایم سی میں پڑھتی تھی۔

عظمیٰ کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔ وہ اپنی فیملی کو سپورٹ کرنے کے لیے جاب کر رہی تھی۔ اس نے فائن آرٹس میں ماسٹرز کیا ہوا تھا اور کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت کر رہی تھی۔ اس کی منگنی اپنے چھوٹے زادے چارپانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ اسے اپنے بھائی کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار تھا۔ وہ چاروں اس سے اچھی طرح ملتیں، جلد ہی اس کی ان لوگوں سے بے تکلف دوستی ہو گئی تھی۔



پہلی تاریخ آئی تو وہ خود کو تیار کرنے لگی ”اسے کس طرح منع کروں گی؟ کیا کہوں گی؟“ اس قسم کے کئی سوال وہ صبح ہی سے خود سے کر رہی تھی۔ رات آٹھ بجے اسے پیغام ملا ”آپ کے کزن باہر گیٹ پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ خود کو تیار کرتی نیچے آ گئی۔ گیٹ تک آئی تو وہاں موجود سیکورٹی گارڈ نے اسے باہر نکلنے کے لیے راستہ دیا۔ وہ گیٹ سے ایک قدم باہر نکلی تو وہ جو اپنے دوست سے کچھ بات کر رہا تھا اسے آنا دیکھ کر جلدی سے اس کے پاس آ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اس کے دوست نے گاڑی کا انجن بھی بند نہیں کیا تھا۔ برابر والی سیٹ کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اس نے شاید اپنے دوست سے کہا ہوگا ”بس ایک سیکنڈ رکو“ میں اس مصیبت سے پیچھا چھڑا کر ابھی آتا ہوں۔ اماں کو بھی کیسے کیسے بھیک منگوں سے رشتے جوڑنے کا شوق تھا۔

”کیسی ہو؟“ معمول کے مطابق سب سے پہلے یہ سوال کیا گیا۔ پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے والٹ سے پیسے نکال کر اسے پکڑتا ہوا بولا۔

”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔“ ہاں اگر وہ سامنے کھڑی ہے تو ٹھیک ہی ہوگی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا جواب سننے وہ رکے جب کہ اسے جلدی بھی بہت ہے۔ اس نے پیسے لینے کے



لے ہاتھ آگے نہیں پڑھایا تو وہ کچھ جھنجھلا کر اسے دیکھنے لگا۔

”مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔“ آخر کار وہ بہت ہمت کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ بھاڑ میں جائے نمک اور نمک خواری۔ ویسے بھی اس دنیا کا دستور یہی ہے لوگ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔ سناپ کو وہ وہ پلاؤ تو وہ ڈس لیتا ہے۔ سوائے بھی آج اس کی تمام نیکیوں کا اگر وہ یہ صلہ دے رہی تھی تو کیا ہوا۔ ایک بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو تمام خوف اور جھجک بھی جانی رہی۔ وہ بہت بے خوفی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ ایک تک حیرت سے بت رہا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کا دوست انتظار سے تنگ آ کر گاڑی کو مکمل حالت سکون میں لے آیا تھا۔ مگر اسے جیسے اب کہیں جانے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ کچھ دیر تک اسے بغور دیکھنے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو وہ اس کے بولنے سے پہلے کہنے لگی۔

”میں جاؤں؟“

”ہاں جاؤ۔“ وہ پتا نہیں کس بات پر مسکرایا تھا۔ اسے خدا حافظ کے بغیر وہ گیت میں کھس گئی تو وہ پیسے واپس والٹ میں ڈالتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس رات سونے کے لیے لیٹی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی بوجھ سے آزاد ہو گئی ہے۔ اس دنیا میں آپ یا تو اپنے باپ کا پیسہ پورے استحقاق کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں یا پھر خود اپنا۔ اس کے علاوہ کسی اور کا دیا صرف احسان ہی ہو سکتا ہے۔ آخر ضرب المثل اور محاورے ایجاد کرنے والوں نے باپ کا مال سمجھ رکھا ہے یا یہ تمہارے باپ کا گھر ہے وغیرہ جیسی باتیں کچھ سوچ کر ہی ہوں گی۔ اگر اب تک کی زندگی بے غیرتی سے گزار دی تھی تو یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ آئندہ بھی ایسے ہی جیا جائے۔

”ہاں اب میں تمہارے حصار سے نکل آئی ہوں اور مجھے طفیلی بن کر زندگی گزارنے کا کوئی شوق نہیں۔“

اتوار کا دن تھا۔ وہ پانچول لان میں چل قدمی کرتے ہوئے گپ شب میں مصروف تھیں۔ تب ہی گیت سے اندر آتے حسن کو دیکھ کر عاتشہ اس سے بولی۔

”فاطمہ! تمہاری کیا سزا فاطمی سے کوئی رشتہ داری ہے۔ تمہارے کزن کے آنے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔“ اس کی اس بات پر وہ سب ہنس پڑی تھیں۔ ابھی کل ہی اس کے کزن شہیار کی کد پر سبز کا فاطمی نے عاتشہ کی خاصی طویل کلاس لی تھی۔ حالانکہ وہ بے چارہ اتنی دور سکھر سے اسے ملنے آیا تھا۔ اس کا کزن سکھر میں اے سی تھا اور اس کے ہر پندرہویں دن چکر لگانے پر وہ سب ہی سمجھ چکی تھیں کہ کیا چکر ہے۔

وہ ان لوگوں سے معذرت کرتی آگے بڑھ کر خود ہی حسن کے پاس آگئی۔ وہ اپنی سابقہ ٹون سے بات کر رہا تھا۔ ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ پرسوں کوئی بات ہوئی تھی۔ معمول کے مطابق اس کی خیریت دریافت کر کے اس نے ایک تھیلی اسے پکڑ لی۔ وہ لینے سے انکار کر دیتی مگر پیچھے کھڑی دوستوں کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے پکڑ لی۔ وہ تین چار منٹ بات کرنے کے بعد چلا گیا تو وہ واپس ان لوگوں کے پاس آگئی۔ وہ سب ندیاں اسی وقت تھیلے پر چھٹ پڑیں۔ اس کے کزن کو دعا میں دیتی وہ اس بڑے سے پراسے انصاف کر رہی تھیں۔ اسے بھی مجبوراً ”چکھنا پڑا۔“

وہ بڑی مصروف زندگی گزار رہی تھی۔ صبح انشٹیٹیوٹ دوپہر اسکول اور پھر رات میں اسکول کے کام کے ساتھ ساتھ اپنی بھی پڑھائی۔ وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کمپیوٹر سے متعلق سب کچھ سیکھ رہی تھی۔ آخر اسی پر اس کے روزگار کا دار و مدار تھا۔ یوں بیٹھے بیٹھے تو پڑھ کر خیر خیر ہو جائیں ”پڑھ لاکھ کی تو اس مزگانی میں اوقات ہی کیا ہے۔ اس سے پہلے وہ جانتی نہ تھی کہ پیسہ کہاں سے آتا ہے اور کیسے کمایا جاتا ہے۔ اس نے تو صرف خرچ کرنا سیکھا تھا۔ اس کی ضروریات تو ہمیشہ بغیر کے پوری ہوئی تھیں۔ مگر اب

یہ تھا کہ اب اس اپنی تمام جزئیات سمیت سمجھ چکی تھی۔ وہ پیسے کو دانت سے پکڑ کر رکھتی تھی۔ جس جگہ سو خرچ کرنے ہوتے وہ کوشش کرتی کہ دس روپے میں کام ہو جائے۔ آنے جانے کے بس کے کرائے کے علاوہ وہ فالتو ایک پیسہ خرچ نہیں کرتی تھی۔ اسی لیے اپنی تنخواہ میں سے بھی کاپی کچھ بچا لیتی تھی۔ حسن اپنے دو رشتہ کے مطابق ہر اتوار کو آتا۔ پانچ چھ منٹ اس کے پاس رکتا وہی ”خیریت سے ہو؟“ کوئی پریشانی تو نہیں۔“ عاتشہ کے سوال جواب ہوتے وہ بھی نارمل طریقے سے ملتی اور وہ چلا جاتا۔

لگے مہینے کی پہلی تاریخ کو وہ پیسے دینے نہیں آیا تو فاطمہ نے اس کی سمجھ داری کو دل ہی دل میں سلام پیش کیا۔ اسے یہاں رہتے چھٹا مہینہ پورا ہونے والا تھا اور وہ حسن سے پہلے خود ہی یہاں کا گراپ ادا کر دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے آئیں تاریخ کو بینک چلی آئی۔ یہ اس کا بینک کا دوسرا چکر تھا۔ اماں کی زندگی میں بھی وہ بہت مرتبہ ان کے ساتھ یہاں آیا جانا کرتی تھی۔ بینک منجر فرقان حمیدی سے اماں کی اچھی سلام دعا تھی۔ اسی حوالے سے وہ اس سے بھی اچھی طرح ملتے۔ بینک کی یہ برانچ اس کے گھر سے بہت قریب تھی۔ پیسے لگوانے سے پہلے اس نے بونٹی اپنا بیلنس چیک کیا تو اکاؤنٹ میں موجود اضافی چھ ہزار روپوں کو دیکھ کر وہ بری طرح حیرت ہوئی۔ فرقان حمیدی کہنے لگے۔

”حسن تمہارے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروا کر گیا تھا۔“ وہ نہ بھی بتاتے تب بھی وہ جانتی تھی کہ یہ حرکت کس کی ہے۔ ان کے سامنے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ ان کے اصرار پر چائے پیتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا جس کا اظہار اس نے فرقان انکل سے کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ کچھ حیران ہو رہے تھے۔

”مصل میں انکل! یہاں عزیز آباد تک آنا کافی مشکل پڑتا ہے۔ اپنے ہاسٹل کے قریب کی برانچ میں پیسے منتقل کروالوں گی تو آسانی ہو جائے گی اور پھر میں

آپ کے ہاں سے اپنا تعلق ختم تو نہیں کر رہی۔ یہاں بھی میرا اکاؤنٹ موجود ہے گا۔“

پھر ان ہی کی بدولت اس نے اپنے ڈیڑھ لاکھ میں سے بھی ہوئی رقم ہاسٹل سے قریب ترین برانچ میں منتقل کروالی۔ اماں کا رٹائرمنٹ پر ملنے والا پیسہ اور یہ چھ ہزار روپے چھوڑ دیے۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ وہ اس کی اس حرکت پر کیا سوچا ہے۔ اس کا جوبل چاہے سوچا رہے۔ میری بلا سے اسے یہ بھی پتا چل گیا ہو گا کہ میں نے اپنی ٹیس بیس سے پیسے لگوا کر بھری تھی۔ پتا چل جائے میری بلا سے۔“

اسے تو میری بلا سے اور مالی فٹ کہہ دیا تھا مگر وہ اماں سے سخت شرمندہ تھی۔

”اماں! مجھے آپ کے غلوں پر رتی برابر بھی شبہ نہیں۔ آپ نے تو میرے ساتھ وہ سب بھی کیا جس کی میں حق نہ تھی۔ آپ کی محبت آپ کا بے لوث ہمارا میرا سرمایہ حیات ہے۔ مگر میں یہ پیسے نہیں لے سکتی۔ پہلے ہی میں آپ سے اپنے حق سے بہت زیادہ وصول کر چکی ہوں۔ ان روپوں پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔“

اس کا اب دوبارہ بینک کی اس برانچ آنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

لگے روز اتوار نہیں تھی مگر وہ پھر بھی چلا آیا تھا۔ وہ اس کی غیر متوقع آمد کی وجہ سے تھوڑے عرصہ میں آئی تو وہ دروازے پر نظر سے جاتے اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی تھکی باری اسکول سے آئی تھی۔ کپڑے بھی نہیں بدیلے تھے۔ اس لیے بھی اس کی آمد پر حیرت کر رہی تھی۔ تھکے تھکے انداز میں سامنے والے صوفے پر بیٹھتے اسے سلام کیا۔ وہ بڑی غور و فکر سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔“ آج حیرت انگیز طور پر، کیسی ہو کا وظیفہ نہیں بڑھا گیا تھا۔

”ہاں! ابھی اسکول سے آکر بیٹھی تھی۔“ وہ اپنی ہزاروں چھپائے بغیر بولی تو وہ ہنس پڑا۔

”کہ میں کسی بلائے ناگمانی کی طرح نازل ہو گیا۔“



ہے ناں۔

اس کی بات کے جواب میں اس نے نو کنٹس والے سیاسی تاثرات چہرے پر سجائے۔ اسے پتا نہیں کیوں اس قدر ہنسی آ رہی تھی۔ مسلسل ہوتی پتیلی کی نمائش فاطمہ کو زہرے بھی بری لگ رہی تھی۔ وہ گھڑی پر نظر پڑا۔ پانچ منٹ گزرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ پانچواں منٹ پورا ہوا تو وہ یوں کھڑی ہوئی جیسے کسی قید سے رہائی ملی ہو۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ بدستور اپنی جگہ جمنا بیٹھا چہرے پر متنی خیزی مسکراہٹ لیے اس کو دیکھ رہا تھا۔ دوبارہ بیٹھنے کا ارادہ ملتوی کیا اور ویسے ہی کھڑی رہی۔ وہ اس کے کھڑے ہونے کا نوٹس لیے بغیر بیٹھا رہا تو تمام تر لحاظ اور مروت بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ بول پڑی۔

والا ہے۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتا کھڑا ہو گیا اور بولا۔

”تم کچھ زیادہ سنجیدہ نہیں رہنے لگیں۔ لگتا ہے تمہاری دوستیں بہت یوراورڈل ہیں۔“

”میں بیٹھ ہی سے سنجیدہ ہوں۔“ اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

کوئی جواب دیے بغیر وہ ابھی بھی یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہا تو وہ بری طرح چڑھی۔ ”آج موصوف کچھ زیادہ ہی فرصت سے ہیں۔ واپسی کا ارادہ ہی نہیں ہے۔“

جبکہ وہ اس کے چہرے کو یوں دیکھتا رہا جیسے کوئی بہت ہی دلچسپ منظر دیکھ رہا ہو۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر وہ کچھ الجھ سی رہی تھی اس لیے خود قصداً

اوجھڑا کر نظریں گھما رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے جان بخشی ہوئی اور وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا تو وہ بھی اپنے کمرے میں آ گئی۔

اتوار کے روز بھی وہ آگیا تو فاطمہ کا موڈ بری طرح آف ہو گیا۔ آخر یہ کسی آسیب کی طرح میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ دل تو چاہا کہ ملنے سے انکار کر دے مگر مصلحت بھی کوئی چیز ہوتی ہے اس لیے نیچے آ گئی۔ اس

دن کے مقابلے میں آج جتنی اندر تھی۔ مگر آنکھیں مسکراتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنی بے زاری چھپانے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ جب تک بات چچی ہوئی تھی چچی تھی اب جب سب کھل گیا تو بلاوجہ بننے کا فائدہ۔ سلام کرنے کے بعد وہ اس کے کچھ اور کہنے سے پہلے خود ہی کہنے لگی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں“ آپ ناقص میری وجہ سے زحمت کر کے اتنی دور آتے ہیں یقیناً اپنی بہت سی مصروفیات چھوڑ کر مجھے کوئی پرانم ہو گا تو میں آپ سے خود ہی کاٹیکٹ کر لیا کروں گی۔“

اصولاً تو اسے اس بات کو اپنی انسلٹ سمجھنا چاہیے تھا۔ وہ سیدھا سیدھا اس کے یہاں آنے کو نا پسند کر رہی تھی۔ مگر وہ یوں مسکرا رہا تھا جیسے کوئی بہت ہی انجوائے کرنے والی بات سنی ہو۔ جیسے یہ پتھویشن اسے بہت مزہ دے رہی ہو۔

اس کی بات کے جواب میں کچھ کے بغیر تین دن فی شاپنگ بیگز اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تمہارے لیے بہت اچھی شاپنگ کر کے لایا ہوں۔ عدیل میرے ساتھ تھا اور اسے لڑکیوں کی چیزیں خریدنے کا براہ وسیع تجربہ ہے۔“

وہ اس کی مسکراہٹ اور ہاتھ میں پکڑی اشیاء پر نظر ڈالے بغیر بولی ”آپ میرے لیے چیزیں مت لایا کریں۔“ جواب میں وہ یوں مسکرایا جیسے یہ جواب اس کے لیے غیر متوقع نہ تھا۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”کیوں اچھا نہیں لگتا؟“ وہ بڑی فرصت سے کیوں کی گردان کرنے میں مصروف تھا۔

”ضروری نہیں کہ میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں۔ معاف کیجئے گا۔ میں کچھ مصروف ہوں۔“

وہ جواب دہتی ایک منٹ سے کھڑی ہو گئی اور اسے خدا حافظ کہتی دروازے سے باہر نکل آئی۔

اس کا خیال تھا کہ اس کی اتنی بد تمیزی اور بد تمذہبی پردہ اس پر ہمیشہ ہمیش کے لیے لعنت بیج دے گا اور

شاید دل ہی دل میں اسے گالیاں دے کر یہ بھی کہے کہ اس کے ٹمک میں تاثر نہیں اور یہ کہ یہ دو ٹکے کی لڑکی جو کل تک میری حقیقت تھی۔ میری دی ہوئی بھیک پر زندہ تھی۔ آج میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے۔ اپنی اوقات بھول گئی ہے۔ مگر وہ اس کے تمام خیالات کو غلط ثابت کرنا ہر اتوار کو چلا آتا۔

ہاں اب وہ اس کے لیے کوئی چیز نہیں لاتا تھا۔ پہلی تاریخ کو پیسے نہیں دیتا تھا۔ یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ تم ہاسٹل کا کرایہ خود کیوں دینے لگی ہو۔ البتہ آتا کھڑے کھڑے بمشکل تین چار منٹ رکتا اور چلا جاتا۔

اسے شاید یاد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کتنی بد تمیزی سے پیش آ چکی ہے۔ معمول کے مطابق خیر خیر بتا دیتا وہ اسے حیران کر دیتا۔ اس کے اتنی مستقل مزاجی سے آنے پر فاطمہ نے یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ بے چارہ ماں سے کیے وعدے کا پابند ہے۔ آخر اسے اپنی اماں دل و جان سے زیادہ عزیز تھیں وہ ان کی کوئی بات کیسے رو کر سکتا ہے۔ حسن کی اس مجبوری سے اس نے بھی سمجھنا کر لیا۔ اور دوبارہ اس کے آنے پر کبھی کچھ نہیں کہا۔

♥ ♥ ♥ ♥

کراچی جیسے شہر کی انتہائی حدوں کو چھوتی مڑگائی نے اس کے تمام ٹانگے ڈھیلے کر دیے تھے۔ تمام تر بچت اور کفایت شعاری کے باوجود بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔

سال بھر کا ڈپلومہ کورس ختم ہوتے ہوتے اسے ایسا لگا کہ اب کسی سے ادھار مانگے بغیر گزارا نہیں ہے۔

ایسی کسی صورت حال سے بچنے کے لیے اس نے اپنے گھر میں بڑی چین اور کانوں کی بالیاں بنو اس کی سگی ماں کی نشانیاں تھیں ایک روز اسکول سے آتے ہوئے اکیلے ہی جا کر بیچ دیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ جیولر

شاپ پر آئی تھی وہ بھی کچھ بیچنے اس کے ہاتھ پاؤں باقاعدہ ٹائپ رہے تھے۔

”ہو سکتا ہے اس نے میری ہونٹ شکل کا فائدہ اٹھا کر مجھے لوٹا ہی ہو۔ مگر یہ کام میں اپنی دوستوں کے ساتھ تو نہیں کر سکتی تھیں۔ لاکھ بے لکھ بے لکھ بات

تو میں کسی سے بھی شیر نہ کروں۔“

پیٹروٹین کا ڈپلومہ اس کے ہاتھ میں آیا تو وہ جویریہ سے ہنسنے لگی۔

”تم اتنے بڑے اور مشہور انگلش نیوز پیپر میں کالم کرتی ہو۔ تمہارے تو بہت کاٹیکٹ ہوں گے۔ پلیر مجھے نہیں جاب دلاؤ۔ اب تو کمپیوٹر کام چھٹا بھی لگا لیا ہے۔“

اس کی بات پر وہ مسکرا دی اور وعدہ بھی کر لیا۔ ہر روز وہ بڑی آس سے اس سے پوچھتا کرتی۔ اس کے روز روز پوچھنے پر ایک دن وہ کہہ بیٹھی ”تم اپنے کزن سے کیوں نہیں کہتیں۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں کچھ سے بہتر جاب دلاوے۔“ اس کی بات پر وہ ہنسنے لگی۔

”اس سے کہنا ہوتا تو تمہاری تمہیں کیوں کرتی۔ صاف کو تم میری مدد کرنا ہی نہیں چاہتیں۔“

وہ جویریہ سے ناراض ہو گئی۔ ”جواب نہیں دلاؤ گی تو مت دلاؤ۔ اگلے دن سے اس نے سٹنگ روم میں باقاعدگی سے بیٹھ کر تمام اخبارات کا کلاسیفائیڈ والا صفحہ دیکھنا شروع کر دیا۔“

اس بات کو ایک ہفتہ ہو گیا تھا اس دن بھی وہ بیٹھی ڈان کا کلاسیفائیڈ دیکھنا لگی تھی۔ جب جویریہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے لنگھائی۔

”رو تھی ہو تم؟ تم کو کیسے مناؤں فاطمہ۔ بولوناں بولوناں۔“ وہ اس کے گانے کا نوٹس لیے بغیر اخبار میں منہ دیے بیٹھی رہی۔

”مت بات کرو میرا کیا ہے۔ گلشن چور گئی کے پاس حیدر زبول ایجنسی میں کمپیوٹر آپریشن کی پوسٹ خالی ہوئی ہے۔ سیکری بھی اچھی ہے اور ماحول بھی مناسب ہے۔“

وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اخبار ایک طرف رکھ چکی تھی اور اب فرط مسرت سے بے قابو ہوئی اسے سن رہی تھی۔

”ٹھیک یو۔ جویریہ ٹھیک یو۔ میں تمہارا شکریہ کہیے اور کیوں۔ تم نے میری کتنی بڑی مشکل حل کر



دی ہے۔ تم کتنی اچھی ہو۔ تمہارے جیسا اچھا تو شاید کوئی اور ہو بھی نہ یو آر گریٹ۔ آئی رینی لویو۔“  
وہ خوشی کے مارے اس سے لپٹ گئی تھی۔ اس پاس بیٹھی لڑکیاں دلچسپی سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں۔  
”ہٹو پرے۔“ مطلبی دوستی کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ ابھی کیسے منہ پھلا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اب اچانک مجھ پر اتنا پیار آگیا۔“ اب ناراض ہونے کی باری جویریہ کی تھی۔

”سوری یار! معاف کر دو ناں۔ بس مجھے تم پر غصہ آ گیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا“ تم میری بات کو سیریس نہیں لے رہیں۔“

”ہر کسی کو بدگمانی کی عینک لگا کر مت دیکھا کرو اور سیریس ہونے کا کیا مطلب ہے۔ میں آنسو بہا کر اور منہ لٹکا کر تمہاری بات سنتی تب ہی تمہارے خیال سے میں سیریس ہوتی۔ آئی ایم سوری میڈم! اس قسم کی سنجیدگی کی توقع آپ مجھ سے کبھی مت رکھیے گا۔“

کچھ دیر روٹھنے منانے کا سیشن چلا پھر وہ اس بات پر مانی کہ فاطمہ اپنی پہلی تنخواہ ملنے پر ان سب کو ٹریٹ دے گی۔ اس نے فوراً ”مان لیا تھا۔“

رات سونے سے پہلے جویریہ نے اسے بتایا ”میرے کولیگ ارشد کے جاننے والے ہیں یہ عبید وارثی صاحب۔ لگ بھگ پچاس سال کے ہیں مگر اس عمر میں بھی ہم لوگوں سے کہیں زیادہ اسمارٹ اور ایکٹو ہیں۔ میں نے ارشد سے کہا تھا کہ کوئی ویکنسی ہو جو کسی لڑکی کے لیے مناسب بھی ہو تو اس نے وہاں کا بتایا۔ وہ سفارش وغیرہ کے سخت مخالف ہیں۔ ارشد کے اصرار پر صرف اس شرط پر راضی ہوئے ہیں اگر تمہاری کارکردگی انہیں مطمئن کر سکی تو تمہیں مستقل اپنے پاس جاب دیں گے ورنہ ایک مہینے بعد چھٹی کر دیں گے۔ یوں سمجھو کہ تم ایک مہینے کے ٹرائل پر رکھی جا رہی ہو۔ اگر کنفرم ہو گئیں تو تمہاری تنخواہ آٹھ ہزار روپے ہوگی اور پہلے مہینے تمہیں صرف چار ہزار روپے دیے جائیں گے۔ اب اگر تم ان

شرائط پر راضی ہو تو کل وہاں چلی جاؤ۔“  
وہ تو اس سے بھی کڑی شرائط قبول کرنے کو تیار تھی سو دل و جان سے راضی ہو گئی۔ نوکری اس کا شوق نہیں ضرورت تھی اور ضرورت تو انسان ہر قیمت پر پوری کرنا چاہتا ہے۔ عبید صاحب خاصے روکھے پھلے سے آدمی تھے۔ اس سے بغیر کسی گرم جوشی کے ملے اور وہ تمام باتیں دہرا دیں جو وہ جویریہ سے پہلے ہی سن چکی تھی۔

وہ اس کی ایڈہاک ملازمت کا پانچواں دن تھا جب کی بورڈ اور ماؤس پر ہاتھ چلاتے اور مانیٹر پر نظریں جمائے اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کی میز کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھا ہے۔ نہ صرف بیٹھا ہے بلکہ بہت غور سے اسے دیکھ بھی رہا ہے۔ فوراً ”سراٹھا کر سامنے دیکھا تو سامنے موجود شخصیت اس کا موڈ بری طرح خراب کر گئی۔ آخر اسے میری جاسوسی پر کس نے مامور کیا ہے۔ وہ بری طرح جل رہی تھی۔ چہرے پر پھیلتی ناگواری اس سے چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔  
”بہنوں کو سلام کرنے سے اللہ بہت خوش ہوتا ہے۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے شوخی سے بولا۔

”اسلام علیکم۔“ اس نے لٹھ مارا۔  
”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو، خوش رہو، خوب ترقی کرو، تمہیں کمپیوٹر آپریٹ کرتے دیکھ کر جتنی خوشی مجھے ہو رہی ہے۔ اتنی شاید خود تمہیں بھی نہیں ہوئی ہوگی۔“ وہ اس کے لٹھ مار انداز کا برا مانے بغیر ہنس کر کہہ رہا تھا۔

”تھینکس۔“ اس نے مختصر جواب دے کر دوبارہ اپنی نظریں اسکرین پر جمادیں۔ حالانکہ پتا تھا کہ اس کی موجودگی میں وہ کوئی کام نہیں کر سکتی۔

”میرا خیال ہے اب تو تم مجھے سوفٹ ویئر اور ہارڈ ویئر کا فرق ضرورتاً بتا سکتی ہو۔“ اس کا وہ مذاق اڑاتا انداز اسے پاگل کر رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا پاس رکھا پیروٹ اٹھا کر اس کے سر پر مارے۔

”کیسی چل رہی ہے جاب؟ کوئی مسئلہ تو نہیں؟“



بڑی فکر مندی سے یہ سوال یوں کیا گیا۔ گویا یہ نوکری اسی کے طفل ملی ہو۔

”آپ کی دعا میں ہیں۔“ وہ دانت پیس کر بولی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

اسی وقت عبید صاحب اپنے آفس سے باہر نکلے تو وہ الارٹ ہو کر جلدی سے کی بورڈ اور ماؤس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ارے حسن عباس ہمارے دفتر میں۔ کیسا خوشگوار سر براؤز ہے۔“ وہ اس کی طرف توجہ دے بغیر آگے بڑھ کر گرم جوشی سے حسن سے ہاتھ ملانے لگے۔ ان کا وہ روڈ اور خشک انداز محول میں غائب ہو گیا تھا۔ وہ بڑے اصرار سے اسے اپنے دفتر میں لے گئے تو فاطمہ کا دل جل کر خاک ہو گیا۔ اپنی اہمیت اور تعلقات جتانے ہی کے لیے مصوف میری جاسوسی کرتے یہاں آئے ہیں۔ کہ دیکھو تم جہاں ٹرائل پر رکھی گئی ہو۔ وہاں میری اتنی عزت اور اکو بھگت ہوئی ہے۔ آج سے محض بعد وہ اور عبید صاحب باہر آئے تو وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ وحیان تو اندر عبید صاحب کے کمرے کی طرف تھا مگر کام سے کوتاہی بھی نہیں برتی جاسکتی تھی۔

”چلو میں تمہیں چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔“ عبید صاحب اور وہ اس کے پاس ہی آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے کوئی بد تمیزی نہیں کر سکتی تھی۔

اس لیے نرمی سے بولی۔

”میں بھی آفس ٹائم ختم ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے۔ آپ چلے جائیں میں آجاؤں گی۔“ وہ اس کے شرفانہ جواب پر بے ساختہ سی مسکراہٹ کو روک رہے ہوئے عبید صاحب سے بولا۔

”کیوں سرا میری کزن کو ایک گھنٹہ پہلے آف مل سکتا ہے؟“ اس کے مذاق کو انہوں نے بڑا انجوائے کیا اور باقاعدہ ایک زور دار قہقہہ لگا کر بولے۔ ”بالکل اجازت ہے جناب۔“

وہ دونوں اس کے سر پر کھڑے اس کے اٹھنے کا

انتظار کر رہے تھے۔ چوہن کچھ ایسی تھی کہ وہ کسی انتہائی رد عمل کا اظہار نہیں کر سکتی تھی اس لیے خاموشی سے کپیوٹر آف کرتی اپنا بیگ لٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ ارادہ یہی تھا کہ باہر نکل کر اسے دو چار کھری کھری سنا کر بس میں سوار ہو جائے گی۔ مگر عبید صاحب کو تمام خوش اخلاقی اور کواب میزبانی آج ہی یاد آ رہے تھے۔ باہر نکل کر انہوں نے اس وقت تک اپنی گاڑی کی طرف قدم نہیں بڑھایا جب تک کہ حسن نے گاڑی اشارت نہ کر لی۔ اس کے برابر گاڑی میں بیٹھی وہ اپنی پسائی کا ماتم کر رہی تھی۔ وہ اپنی کامیابی پر بڑا خوش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وسائیل کرتے ہوئے کسی انگلش گانے کا میوزک دیا جا رہا تھا۔

خیالات کی رو پلٹی تو اس نے اس گاڑی پر غور کیا۔ اچھا تو جناب نے ذاتی گاڑی خرید لی ہے۔ آفس کی گاڑی تو یہ کہیں اور استعمال نہیں کرتے کہ بے چارے بہت ایمان دار، فیور اور انا پسند ہیں۔ وہ اس بلیک سوک کو بڑی نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ اسے رو کرنے کی خواہش اتنی شدت سے ابھرتی تھی کہ دل چاہتا تھا اسے اور اس سے وابستہ تمام چیزوں کو ملیا میٹ کر دے۔ گاڑی کا رخ بائیں جانے والے راستے پر نہ دیکھ کر وہ بول پڑی۔

”کہاں جا رہے ہیں؟“

”تمہیں اغوا کر رہا ہوں۔“ بڑے سکون سے جواب دیتا وہ ڈرائیونگ کرتا رہا۔ وہ ابھی اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی جب اس نے گاڑی کے ایف سی کے سامنے روکی۔ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر اترتا وہ اس کی طرف آگیا۔

”تو کیا فریہ ہو گئی ہو۔“ اس کے بولنے کی وجہ تھی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور اس کی طرف دیکھے بغیر قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ اسے بس اسٹاپ کی طرف جانے دیکھ کر اس کے پیچھے آیا اور قدرے ناراض لہجے میں بولا۔

”تم تو بہت ہی بد تمیز ہو چکی ہو۔“

خواجہ خواجہ دوسروں کی جاسوسی نہیں کرتی، کسی کے پرسنل میں مداخلت نہیں کرتی اور دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے چھچھوری حرکتیں نہیں کرتی۔“ وہ بغیر کوئی لحاظ روا رکھے بڑی بد تمیزی سے بولی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

”کاش آج اماں زندہ ہوتیں تو اپنی لاڈلی کی قرآن سے چلتی زبان دیکھ کر عیش عیش کرا لیتیں۔“

اس کی بات پر ایک ہوک سی دل میں اٹھی ”اماں ہوتیں تو کیا میں یوں سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی ہوتی۔ تمہیں تو میں کبھی معاف نہیں کروں گی حسن عباس کہ تم نے مجھ سے میری ذات کا کھرچینا۔ اماں کی بے تحاشا محبت جو میں نے اپنا حق سمجھ کر وصول کی تھی۔ آج مجھے احسان محسوس ہوئی ہے۔ تم میرے اتنے بڑے مجرم ہو کہ میرا دل بھی تمہاری طرف سے صاف نہیں ہو سکتا۔“ لہجے عرصے بعد اسے اپنی آنکھیں کھلی محسوس ہو رہی تھیں۔ وگرنہ اسے آئو ہائے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ زندگی سے لڑنے میں اتنی مصروف ہوئی تھی۔ رونا بھی یاد نہ رہتا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر گہری نظریں جمائے کھڑا تھا۔

اسی وقت ان کے پاس ایک گاڑی آکر رکی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر عائشہ چھینی۔

”ہائے فاطمہ جانو! تم یہاں کیا کر رہی ہو۔“

وہ اپنی آنکھیں خشک کرتی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بڑی ایکسپریٹ نظر آ رہی تھی۔ اس کے اتنی زور سے جانو لہنے پر اسے بڑی شرمندگی سی ہوئی۔ جبکہ اس کے ساتھ گاڑی سے اترتا شہیار اور حسن دونوں ہی ہنس پڑے تھے۔ جب سے ان دونوں کا نکاح ہوا تھا۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے اس سے ہاتھ ملے باہر مل لیا کرتی تھی۔

اس کے ساتھ کھڑے حسن کو دیکھ کر وہ بڑے معنی خیز انداز میں کھکاری اور پھر آنکھوں آنکھوں میں اسے ویل ڈن کا اشارہ بھی کیا۔ وہ اس کے اشاروں کو کنکالوں سے توجہ ہٹا کر شہیار سے سلام دعا کرنے لگی۔ عائشہ نے شہیار اور حسن کا آپس میں تعارف

کروایا۔

”میرا خیال ہے۔ آپ لوگ بھی کے ایف سی ہی آئے تھے۔“ عائشہ نے پچھلے منہ سے

”جی ہاں! حسن نے فوراً جواب دیا۔

”کیا خیال ہے آپ کا ہمیں جوائن کرنے کے بارے میں؟“

شہیار نے حسن سے دریافت کیا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ

دعوت میری طرف سے ہوگی۔ آخر آپ دونوں ہی

ہمارے کراچی میں مہمان ہیں اور مہمانوں سے حسن

سلوک اہل کراچی کی روایت ہے۔“

وہ لوگ اس کی بات پر ہنس پڑے تھے۔ ”آپ کہتے

ہیں تو مان لیتے ہیں۔ ویسے مشہور تو یہ ہے کہ کراچی

والوں سے زیادہ روکھا پچا کیکیز مان سارے پاکستان میں

کہیں نہیں پایا جاتا۔“

وہ لوگ باتیں کرتے اندر چلے آئے تھے۔ ناچار

اسے بھی ان لوگوں کی تقلید میں قدم بڑھانے پڑے

تھے۔

”تم دونوں ساتھ کھڑے زبردست لگ رہے

تھے۔“ عائشہ اس کے کان میں منمنائی تو وہ موقع ملنے

زناکت کا خیال کرتے ہوئے چپ رہی۔ اندر بیٹھ کر وہ

اور شہیار آپس میں باتیں کرنے لگے تھے۔ جبکہ عائشہ

ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی اور وہ ارد گرد بیٹھے

لوگوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہوا تو عائشہ نے عادت

کے مطابق بغیر تکلف کے کھانا شروع کر دیا۔ شہیار

اسے ٹوک رہا تھا۔

”کچھ کیلوریز کا خیال کیا کرو۔ دن بدن موٹی ہوئی جا

رہی ہو۔“ وہ ان کنٹنس کا ٹوٹس لیے بغیر کھا رہی۔

”آپ کیسی دوست ہیں اسے سمجھاتی نہیں ہیں۔

میرے جیسے اسمارٹ بندے کے ساتھ چلتی یہ کیسی

لگے گی۔ اگر جو اس نے اپنی ڈانٹ کو کنٹرول نہ کیا تو۔“ وہ فاطمہ کو اس کی کوتاہی سے آگاہ کرنے لگا تو وہ مسکرا



”میر صادق کی کٹائی ادا کر رہا ہے اور تم وائٹ نکال رہی ہو۔ چلو آج ہاسٹل بتاؤں گی تمہیں اچھی طرح۔“

عائشہ نے ہنسی کا سب لیتے اسے گھر کا حسن ان لوگوں کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہوتا مسکرا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کھانی کرجب وہ لوگ باہر نکلے تو عائشہ بھی اس گھرے اور حسن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شہیاران لوگوں کو خدا حافظ کہتا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اسے ابھی واپس سکھر جانا تھا۔ رات میں فریال کے کمرے میں ان لوگوں کی محفل جی تو عائشہ نے چٹارے لے لے کر آج کا واقعہ سنایا۔ اس کی بات سن کر وہ سب ہی اس کے پیچھے پڑ گئیں۔

”اچھا تو سوئیٹ کزن سے اب باہر بھی ملاقاتیں ہونے لگی ہیں۔ وہ بھی دوستوں سے چوری چھپے۔“ ان سب کے ہاتھ ایک دلچسپ موضوع آیا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک آدھ مرتبہ اس قسم کی بات ہوئی تھی مگر آج تو ان لوگوں نے اس کا خوب ہی ریکارڈ لگایا تھا۔ اسے حتیٰ اور میسنی قرار دیا گیا تھا۔ جو خواہ مخواہ دوستوں کے سامنے بنتی ہے۔ وہ ان لوگوں کی بے سربا باتوں پر سرپیٹ سکتی تھی سوچ رہی۔

اگلے روز دفتر گئی تو عبید صاحب کا رویہ یکسر بدل ہوا تھا۔ کل تک جو اسے ایک سفارشی سمجھ کر اس کی ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھا کرتے تھے۔ اچانک ہی مہیاں ہو گئے تھے۔ ان کی اس مہیاں کا پس منظر اچھی طرح پتا تھا۔ اس لیے اسے کوئی خوشی نہ تھی۔

اگر وہ اپنی کارکردگی کی بنیاد پر یہاں جبکہ بنائی اور عبید صاحب اس کے کام سے خوش ہو کر اسے اہمیت دیتے تو وہ خوشی سے پھولی نہ ساتی۔ مگر اب ان کا بدلہ ہوا انداز اسے اپنی ہنگ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اتنی بے بس مجبور اور لاچار ہے کہ ساری زندگی دوسروں کی غنائیوں کے سہارے گزارے گی۔ یہ خیال سوہان روح تھا۔ پہلی تنخواہ کے طور پر آٹھ ہزار روپے وصول کرتے وہ اپنی محنت کی کمائی کو بھی کسی کی دی ہوئی بھیک سمجھ رہی

تھی۔ عبید صاحب نے اس سے کہا تھا کہ میں تمہاری کزن ہونے کے ناطے وہ اس بات کی مستحق ہے کہ اسے کسی آناکشی دور سے گزارے بغیر مستقل کر دیا جائے۔

اسے تو کمری کرتے تقریباً ”ایک سال ہونے والا تھا۔ اس روز کے بعد حسن دوبارہ کبھی اس کے دفتر نہیں آیا تھا۔ ہاں التوا کو چکر لگانا وہ کبھی نہ بھولتا تھا۔ وہی دو چار منٹ رکنا۔ خیر خیر پت کرنا اور چلا جانا۔ اس دوران اس نے انٹر نل پروگرامنگ اور لی کامرس کا چھ مہینہ کا ایڈوانس ڈیپلوما کورس بھی کر لیا تو اس کی تنخواہ میں ہزار روپے کا اضافہ ہو گیا۔

اپنے ورکرز سے کام لینے میں عبید صاحب بڑے سخت ہاں تھے۔ کام کے معاملے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ صبح سے شام تک انتہائی سخت محنت کرتی تو وہ نو ہزار اسے ملتے تھے۔ چھٹی یا ہاف ڈے لیو وغیرہ کی سخت ممانعت تھی۔ عبید صاحب سے چھٹی لینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ محنت سے نہیں گھبراتی تھی اور پھر یہاں کا ماحول بھی اچھا تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ یہ نوکری بھی اسے خوش قسمتی ہی سے مل گئی تھی اور وہ اسے کسی قیمت پر گنوا نا نہیں چاہتی تھی۔

اس رات وہ سب عظمیٰ اور عائشہ کے مشترکہ کمرے میں ٹافوں میں دبی ڈرائی فرانس سے شغل فرما رہی تھیں جب اخروٹ منہ میں ڈالتی فریال اس سے بولی۔

”آج تمہارا کزن ملا تھا۔“ اسے اس کزن نامے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے یہ نہیں بوجھا کہ کہاں ملا؟ کب ملا؟ وہ خود ہی مزید تفصیلات بتانے لگی۔

”میں نے بتایا تھا ناں کہ مجھے autocad سیکھنا ہے۔“

”Auto cad کیا بلا ہے۔ پہلے تو یہ بتاؤ۔ آگے کی بجائے بعد میں کرنا۔“ جویریہ نے اسے ٹوکا۔

”بھئی ویسے تو ہم لوگ draughting

manual کرتے ہیں۔ لیکن autocad ایک بنانا یا soft ware package جس کی مدد سے ہم کمپیوٹر پر کم وقت میں اور زیادہ accuracy کے ساتھ اپنی drawings بنا سکتے ہیں۔“ فریال نے کاجو منہ میں ڈالتے جواب دیا۔

”اچھا تو کزن صاحب کا اس میں کیا ذکر ہے؟“ عظمیٰ نے دریافت کیا۔ وہ وہیں ساڈ ٹیبل پر رکھی الیکٹرک کیبل میں ان لوگوں کے لیے کافی بنا رہی تھی۔

”بتاتی ہوں۔ اصل میں ہمیں اپنی پرحالی میں ان دنوں autocad سیکھنے کی شدید ضرورت ہے۔ میرے تمام کلاس فیلوز وغیرہ نے autocad 2D اور 3D دونوں سیکھ لیے ہیں۔ بس ہم چارپانچ نیکیاں ہی رہ گئی ہیں۔ تمام کلاس فیلوز نے بھی اور کچھ نیچر نے بھی ایک انیشیٹیو کی بہت تعریفیں کیں۔ زیادہ تر اسٹوڈنٹس وہیں سے کورس کر کے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ بعض نیچر بھی جنہوں نے پہلے سے کورس کیا ہوا تھا۔ اسی انیشیٹیو سے ریفریشر کورس کر کے آئے۔ ہمیں بھی وہیں جانے کا مشورہ دیا گیا تو میں ‘جتنا‘

فصلہ اور زیبا آج وہاں پہنچ ہی گئے۔ بہادر آباد میں بڑا شاندار سائنسٹیوٹ ہے۔ وہ جس کے مالک ان محترمہ کے کزن حسن عباس صاحب ہیں۔ اسے کبھی توفیق نہ ہوئی کہ دوستوں کو بتا دیتی کہ سکیموں کو کمپیوٹر کورس کرنا ہو تو اپنے گھر ہی کا انشٹیٹیوٹ ہے وہاں سے رجوع کرو۔“ فریال نے بات ختم کر کے آخر میں اسے پھٹکارا۔

وہ چپ چاپ اس کی باتیں سن رہی تھی۔ عظمیٰ نے کافی کے ٹک ان لوگوں کے ہاتھوں میں پکڑائے تو عائشہ پوچھنے لگی۔

”کیسے کیسے پتا چلا کہ وہ انسٹیٹیوٹ اس کے کزن کا ہے؟“

”مجھے کیسے پتا چلتا۔ ہم لوگ تو وہاں ریسپریشن فارم پر اسپیکنس لے رہے تھے جب وہ ہمارے پاس سے گزرتا ہوا گزرا۔“

”بھئی ہر قسم کے windows اور Dos کے حوالے سے تمام کورسز ہی وہاں ہوتے ہیں۔ بہت

میں نے آگے بڑھ کر سلام دعا کی۔ پہلے تو وہ پچھانا نہیں۔ پھر جب فاطمہ کا حوالہ دیا تو پہچان گیا۔ پھر ٹوکیا وی آئی بی سلوک ہمارے ساتھ ہوا۔ میں بتا نہیں سکتی۔ ہمیں بڑے عزت اور احترام سے اپنے شاندار سے آفس میں لے جا کر بٹھایا گیا۔ مزے دار سی چائے پلائی گئی۔ میری فرینڈز بھی اس خاص سلوک پر حیران ہو رہی تھیں۔ میں نے یونی غداق میں کہہ دیا کہ تعلقات کے حوالے سے آپ کو ہم سے فیس میں کچھ رعایت کرنی چاہیے۔ اس وقت تو وہ مسکرا کر چپ ہو گیا مگر جب باہر آکر ہم لوگوں نے فارم جمع کروایا تو اکاؤنٹینٹ صاحب نے ہم سے فی ٹوکی ساڑھے سات ہزار کی جبکہ پانچ ہزار روپے وصول کیے تو میری دوستیں خوشی سے پاگل ہو گئیں۔“

فریال کے بات ختم کرنے کی دیر تھی۔ وہ سب نہایت معنی خیز مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ ان لوگوں کی مسکراہٹ نظر انداز کر کے فریال سے پوچھنے لگی۔

”تنتے دنوں کا کورس ہے؟“

”ایک مہینے کا کورس ہے۔ ہفتے میں تین دن کلاس ہوگی۔ سنا ہے وہاں کے سارے انسٹرکٹر فریش گریجویٹ اور بڑے پنڈت اور اساتذہ ہیں۔ ویسے تمہارے کزن صاحب خود کلاس نہیں لیتے۔ ہمارے تھے کہ وہ صرف دو تین گھنٹوں کے لیے وہاں آتے ہیں۔ باقی وقت کہیں اور مصروف ہوتے ہیں۔ میری دوستیں کہہ رہی تھیں جس کی غیر موجودگی اتنے معنی رکھتی ہے۔ اگر وہ ساتھ ہوتی تو شاید ہم مفت ہی کورس کر لیتے۔“

فریال دوبارہ پٹری سے اتری تو وہ ناراض لہجے میں بولی ”مفتول باتیں مت کیا کرو۔“

جویریہ اس کی ناراضی محسوس کر کے موضوع بدل گئی ”اور کون کون سے کورسز وہاں کرائے جاتے ہیں۔“

”بھئی ہر قسم کے windows اور Dos کے حوالے سے تمام کورسز ہی وہاں ہوتے ہیں۔ بہت



اچھی رہی پویشن ہے وہاں کی۔ ہمارے ہاں کے تو تمام اسٹوڈنٹ جوتی درجوں میں جا رہے ہیں۔“

رات سونے کے لیے بیٹی تو عجیب سا دکھ اسے اپنی لپیٹ میں لے گیا۔ کبھی ہم کتنے قریب تھے۔ ایک دوسرے کی ہر خوشی اور ہر دکھ شہیر کرتے تھے۔ اس کے بی سی ایس کرنے پر اس کے ساتھ جا کر آئیں کریم کھانا یاد آیا تو خواہ مخواہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ آج اتنے انجبی اور ایک دوسرے سے اتنی دور۔ ہاں تمہاری نظروں میں میری اوقات ہی کیا ہے جو تم مجھ سے اپنی کوئی خوشی یا کامیابی شہیر کرو۔ میں تو تمہارے راستے کی وصول ہوں۔ ایک گلے پڑا وصول جسے تم بجانے پر مجبور ہو۔ اسے اپنا او اس ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر وہ اپنی اس کیفیت سے پیچھا بھی نہیں چھڑایا رہی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

فریال کو برٹش لائبریری میں اپنے کچھ نوٹس بنانے تھے۔ وہ اتفاق سے فارغ بھی اور جویریہ وغیرہ کے نہ ہونے پر بور بھی ہو رہی تھی سو اس کے ساتھ چلی آئی۔ چھٹی دیر وہ نوٹس بناتی رہی وہ اپنی پسند کے موضوعات پر کتابیں دیکھتی رہی۔ واپسی میں فریال نے اس سے کہا۔

”مجھے بلال صاحب سے سی ڈی لینے ہے۔ اگر تمہیں ویرنہ ہو رہی ہو تو پہلے اسٹیٹیوٹ چلیں۔“ وہ اپنے اسٹیٹیوٹ کا نام لے کر بولی تو اس نے سر ہلا دیا۔ گاڑی اسٹیٹیوٹ کے سامنے روک کر وہ اسے دو منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر اندر چلی گئی تو وہ اس شاندار سی جگہ کو دیکھنے لگی جس کے ماتھے پر اس کی اماں کے نام کی تختی لگی تھی۔ اسی وقت فریال کی گاڑی کے آگے آکر ایک بلیک سوک رکی۔ اس میں سے اترتے حسن کو دیکھ کر اسے کوئی حیرت نہ ہوئی مگر برابر والی طرف کا دروازہ کھول کر اترتی اس بے تحاشا خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ بے حد خوب صورتی عطا کرتا ہے۔ وہ ان ہی لوگوں میں سے تھی۔ اسے شاید اپنے اس حد سے

بڑھے ہوئے حسن کا بے حد احساس بھی تھا اس لیے انداز میں ایک عجیب سی شان بے نیازی محسوس ہو رہی تھی۔ شانوں پر لہراتے سلی پر اوٹن ہاں جنہیں وہ بڑی اداسے جھٹک کر پیچھے کر رہی تھی۔ سلیٹے سے کیے میک اپ نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ نرم و نازک سراپے پر وہ خوب صورت اور دیدہ زیب ہرے رنگ کا لباس شاید بنائی اس کے لیے تھا۔ گاڑی سے اترتی وہ حسن سے کچھ بولتی مسکراتی تو اس کے گالوں میں پڑنے والے لمبیل کو دیکھ کر شاید کچھ دیر کو وہ بھی اسی کی طرح مبسوت رہ گیا ہو گا۔ اسے اپنے آس پاس عجیب سا تاننا پھیلنا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ حسن کو نظر نہ آئے وہ اسے دیکھے بغیر اندر چلا جائے۔ مگر اس کی اس سے پہلے کون سی خواہشات پوری ہوئی تھیں جو یہ ہوتی۔

اسے جواب دے کر وہ جونہی مڑا۔ اس کی نظر سیدھی اسی پر پڑی۔ ایک لمحے کو کچھ حیران سا ہونا اس کے پاس چلا آیا۔

”تم یہاں؟“ وہ سوالیہ انداز میں بولا۔ اس کے پیچھے کھڑی وہ لڑکی بھی اسی طرف چلی آئی تھی۔

”میری فریڈ کو یہاں کچھ کام تھا۔ میں اسی کا وٹ کر رہی ہوں۔“ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”تو باہر کیوں بیٹھی ہو۔ اندر چلو ہاں۔“ وہ مسکرایا تھا۔ اس سے دو قدم پیچھے کھڑی وہ لڑکی اب کچھ حیران ہونے لگی تھی۔

”نہیں وہ بس آنے والی ہے۔ اسے ایک دو منٹ ہی اور لگیں گے۔“ وہ اس پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ روڈ پر نظریں دوڑانے لگی۔

”چلو حسن! دیر ہو رہی ہے۔“ وہ اسے خاطر میں لائے بغیر اپنے ساتھ کھڑے شاندار بندے سے مخاطب ہوئی تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”میں تعارف تو کرنا حاصل کیا۔ یہ فاطمہ ہے میری کزن اور یہ شفیق ہیں۔“

”ہیلو۔“ اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر شفیق نے

ہیلو کہا تو جواب میں اس نے بھی ”ہیلو“ کہنے پر اکتفا کیا۔

”حسن! یہ تمہاری وہی کزن ہیں جو بائبل میں رہتی ہیں؟“ نظر ہر اس سیدھے سوال کے پیچھے چھپے معنی وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ شاید وہ کہنا تو یہ چاہتی ہو گی کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا کوئی گھر نہیں جو لاوارث ہے مگر شوکر کو تنگ کر کے لفظوں کو بیٹھا کیا گیا تھا۔

”جی ہاں“ میں وہی کزن ہوں۔“ اس نے خود اعتمادی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر جواب دیا۔ وہ جو اپنی بات کا جواب حاصل کرنے کے لیے حسن کی طرف دیکھ رہی تھی ہرے غصے سے اس لڑکی کو دیکھنے لگی جو بڑی معمولی سی تھی۔ حسن نے چونک کر اسے دیکھا جو اس غور سے تھے سوالی کو جواب دے کر اب روڈ پر دوڑتی بھاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت فریال تیز قدموں سے چلتی ان لوگوں کے پاس آئی اور حسن اور شفیق سے ہائے ہیلو کرتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ دونوں اس کے گاڑی اشارت کرنے سے پہلے اندر جا چکے تھے۔

”دیکھا تم نے شفیق شاہ کو؟“ فریال نے گاڑی اشارت کرنے کے بعد کہا۔

اس کے کچھ کہنے سے پہلے وہ خود ہی مزید بولی۔ ”چلو مان لیا کہ آپ بہت خوب صورت ہیں مگر یہ محترمہ تو خود کو کچھ زیادہ ہی اونچی نشے سمجھتی ہیں۔ ذرا سی کیٹ سے شکل کیا ملتی ہے خود کو سچ کی کیٹ و نسلیٹ سمجھنے لگی ہے۔ تم ذرا خیال رکھنا تمہارے کزن صاحب کے آج کل کچھ زیادہ ہی پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ کیٹ اصل کی روزین جائے اور تمہارا کزن جیک اور تم دو بیکتی رہ جاؤ۔“

”تمہیں سی ڈی مل گئی۔“ اس کی بات کے جواب میں فاطمہ نے کہا تو وہ بھی اس ذکر کو بھول اپنی سی ڈی کی باتیں کرنے لگی۔ موضوع بدل جانے پر اس نے سکون کا سانس لیا۔

اسنے کمرے میں آکر وہ پتا نہیں کیوں آئینے کے سامنے کھڑی خود کو لکڑی دیر تک دیکھتی رہی۔ بغیر کسی

بناؤ سنگھار کے دھلا دھلا چہرہ حالات سے لڑتی اور جدوجہد سے بھرپور زندگی گزارنے کی گواہ تھکی ہوئی پوجھل آنکھیں۔ شاید وہ بھی خوب صورت لگ سکتی تھی اگر قیمتی ملبوسات پہنتی۔ بہترین کاسمیٹکس استعمال کرتی اور اگر زندگی اس پر یوں تلک نہ ہوتی۔ وہ نو ہزار ماہوار کمانے والی وکیلوں کے دھکے کھاتی بے حد معمولی لڑکی جس کا حوالہ یہ تھا کہ وہ بے گھر ہے اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اس کے پیلا شفیق شاہ کے پیلا کی طرح کوئی بہت بڑے لائبر نہیں۔ اس رات تکیے میں منہ چھاکر وہ کتنی ہی دیر روٹی رہی تھی۔

اگلے روز اتوار تھا اور اسے اپنا تماشا لگوانے کا کوئی شوق نہیں تھا اس لیے فریال کے ساتھ اس کے کاموں کے گھر چلی آئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی روٹی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر وہ کسی خوش قسمتی کا شکار ہو۔ فریال کے ماموں، ممانی اور ان کے دونوں بیٹے جو بے حد شرارتی تھے ان کے ساتھ سارا دن گزار کر واپس آئی تو کسی سے پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ وہ آیا تھا یا نہیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

جویریہ نے اپنے کو لیک مصطفیٰ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ سب کی سب بے حد خوش ہوئیں۔ اسے خاص طور پر بہت خوشی ہوئی تھی وہ اس کی باری سہیلی جو ہر مشکل میں اس کے کام آتی تھی اور جس کو دیکھ کر اس نے زندہ رہنے کا ذہنک سمجھا تھا۔ اس کی خوشی درحقیقت اس کی اپنی خوشی تھی۔ اس کی مبارکباد کے جواب میں وہ بولی تھی۔

”لوگ صحیح کہتے ہیں کہ شادی ایک جوا ہے اور میں یہ جوا ایک مرتبہ پھر خیل رہی ہوں۔ لیکن اس بار میں نے کسی سے بھی کوئی توقعات وابستہ نہیں کیں۔ اس لیے اگر کوئی دکھ اٹھانا پڑا تو سہہ اول کی۔ ہم جب تک دوسروں سے امیدیں رکھتے ہیں۔ اس وقت تک ناخوش رہتے ہیں۔ میں کسی سے بھی کوئی امید کوئی آس نہیں رکھتی۔ اسی لیے دیکھ لو، کتنی خوش رہتی ہوں۔“



دنیا دکھاوے کے لیے اس کے بھائیوں نے بھی اس موقع پر آگے بڑھ کر اپنے گھر سے بہن کو رخصت کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس کے ہاسٹل سے بڑے بھائی کے گھر شفٹ ہونے سے پہلے آخری دن ان چاروں نے اسے پراہٹ میں فیوٹل پارٹی دینے کا پروگرام بنایا۔

وہ پانچوں ہنستی مسکراتی فریال کی گاڑی میں شخصہ کر رہا ہٹ پیچھے۔ سب نے تیاری بھی خوب دل لگا کر کی تھی کہ واپسی میں تصویریں کھینچنے کا پروگرام تھا۔ پراسے انصاف کرتے وہ سب ہی بے فکری سے ہنسنے اور باتیں کرنے میں مشغول تھیں۔ خوب چھینا بچھنی ہو رہی تھی۔

”ہمارے گروپ میں بس اب یہ فاطمہ بی بی ہی بچی ہیں باقی تو سب خیر سے فارغ ہو گئے۔“ عائشہ نے بڑا سادہ لہجے سے کہا۔

”کیوں یہ فریال بھی تو ہے۔“ عظمیٰ نے نکتہ اعتراض اٹھایا۔

”اس کی فکر نہ کرو۔ سنا نہیں آج کل بلال صاحب اسے بڑی سی ڈی فراہم کر رہے ہیں۔ جس دن کلاس آف ہوئی ہے اس دن بھی بڑا دل لگا کر ایکسٹرا پڑھاتے ہیں۔“

عائشہ نے شرارت سے کہا تو فریال بڑی طرح جھینپ گئی۔ جبکہ وہ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھیں۔ ان لوگوں کی ہنسی سے تنگ آکر وہ اپنی جھینپ مٹانے کو اس پر الٹ پڑی۔

”تمہیں بڑی ہنسی آرہی ہے۔ ایسے تو میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ فاطمہ بیگم کی فکر کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ آخر کزن صاحب جو موجود ہیں۔“

”بھئی میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا جو میرے پیچھے پڑ رہی ہو۔ بہتر ہو گا کہ اپنی توپوں کا رخ اس موٹی تنگ ہی رکھو۔“

اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔ اپنے موٹی کے جانے پر عائشہ صدمے سے پاگل ہونے لگی۔

”تم مجھے موٹی کہہ رہی ہو؟“

”میں نہیں“ وہ اے سی صاحب فرما رہے تھے اس روز۔ ”اس نے عائشہ کو چھیڑا۔“

”چھا اس روز جب آپ کے کزن صاحب نے کے ایف سی میں آپ کو دعوت دی تھی۔“ عائشہ جل کر بولی۔ ”وہ جواب میں مسکرا دی۔“

”تم بس پیشہ کر مسکراتی رہنا اور وہ کیٹ ونسلٹ دیکھ لینا۔ لے اڑے گی اسے۔“ فریال نے اسے ڈانٹا۔ وہ سب بھی کیونکہ عائشانہ شفق شاہ سے واقف تھیں اس لیے سب ہی شروع ہو گئیں۔

”میں تمہاری جگہ ہوتی اور ساری دنیا کی حسینا میں بھی آجاتیں جن میں میڈونا، بروک شیلڈ، ایشورا، سشیتا، ڈایانا، جولیا رابرٹ کیٹ اور لارا دتانی کیوں نہ شامل ہوتیں۔ اپنا حق کسی کو اتنی آسانی سے ہرگز نہ لے جانے دیتی۔“ عائشہ نے اسے غیرت دلانے کی کوشش کی۔

”تم پر تو وہ مثال فٹ بیٹھتی ہے کہ روم جل رہا تھا اور نیو یارکری بجا رہا تھا۔ لڑکی بچھ کر۔ نہیں تو تمہارا ٹائی ٹیکٹ خوب جائے گا۔“ عظمیٰ نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”اگر اسے کوئی کیٹ پسند آئی ہے تو ہم آپ کیا کر سکتے ہیں سوائے صبر کے۔“ وہ ان لوگوں کی اوٹ چٹانگ باتوں پر ناراض ہونے کے بجائے اطمینان سے بولی۔

اس کے کیٹ کہنے پر وہ سب ہی ہنس رہی تھیں۔

”تمہیں اس سے جینسی تو میل ہوتی ہوگی؟“ جویریہ پہلی مرتبہ اس موضوع پر بولی۔

”اصل میں تم لوگوں کا اللہ تمہارا کزن اور ہائے تمہارا کزن نن سن کر میرے کان پک چکے ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے آج میں صاف صاف اپنے خیالات بتا رہی ہوں۔“

وہ ان لوگوں کی حیرت کے جواب میں بولی۔

”اب تم کوئی جھوٹ کا پلندہ بناؤ گی۔ جی میں تو اسے اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ تم لوگوں کی توفیقیت ہی خراب ہے وغیرہ وغیرہ۔“ فریال نے اس کے انداز کی نقل اتارتے ہوئے کہا تو وہ سب ہی تائید کرنے لگیں۔

”اتنے پیڑ سم بندے کو کوئی پاگل لڑکی ہی اپنا بھائی

بنائے گی۔ جبکہ وہ بے حد کوالیفائڈ اور ریفائنڈ بھی ہو۔“ عظمیٰ نے فیصلہ سنایا۔

”وہ بہت پیڑ سم ہو سکتا ہے بہت کوالیفائڈ بھی اور شاید ایک کامیاب انجینئر بھی مگر کم از کم ایک اچھا انسان ہرگز نہیں ہے اور میرے لیے کسی آدمی کا اچھا ہونا یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھا انسان ضرور ہو اور جو ایسا نہیں ہے تو وہ چاہے ماگنٹو سافٹ کا چیئر مین ہو یا بل کلنٹن میں اسے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔“ اس کی بات پر وہ سب حیران رہ گئیں۔

”ایسے تو مت کہو۔ اتنا اچھا تو ہے بے چارہ۔ تمہارا کتنا خیال رکھتا ہے اب تو اس کا ہر سٹڈے کو ہاسٹل آتا بالکل اسی طرح کا Universal truth (عام لکیر سچائی) بن چکا ہے جیسے زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے یا سورج مشرق سے لگتا ہے اسے عرصے میں بچال ہے وہ بندہ بھی ایک سٹڈے غائب ہوا ہو۔“ عائشہ نے اس کی بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔

”وہ کوئی اور بات ہے جو تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بہر حال موصوف میرے عشق میں جھٹا ہو کر یہاں ہرگز نہیں آتے۔“ اس نے پتیلی پیتے ہوئے جواب دیا۔

”اور جو تمہاری وجہ سے ان لوگوں کی فیس معاف کی تھی وہ۔“ جویریہ نے ایک اور پوائنٹ اٹھایا۔

”آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے بتا دوں میری وجہ سے نہیں ان لوگوں کی اپنی وجہ سے۔ دنیا کے تمام ہی مزدگھر کے باہر ملنے والی خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ اتنے ہی نرم دل ہوتے ہیں۔ جب کہ وہ لڑکیاں اس کی اساتذت میں پرہیز طرہ قد ہو کر اسے آسمان پر بھی چڑھا رہی ہوں۔ درحقیقت اسی قسم کی باتوں اور تحریفوں نے موصوف کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا ہے اور اب ہم آپ تو انہیں معمولی کپڑے کوڑے ہی نظر آتے ہیں۔“

اس کی بات پر فریال کو سب سے زیادہ غصہ آیا۔ ”شرم کرو تو تمہارا کزن سے جس کے بارے میں تمہیں

فضول بکواس کر رہی ہو۔“

”کزن ہے تو کیا ہوا۔ انسان کو کچ بولنے کی ابتدا اپنے گھر ہی سے کرنی چاہیے۔“ اس کی سبے نیازی قابل دید تھی۔

”اور جس کیٹ کا تم غم منا رہی ہو۔ وہ کبھی بھی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ شادی کے لیے تو کوئی بھولی بھالی معصوم سی لڑکی منتخب کی جائے گی۔ یہ مزید بھی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرتے جو پہلے ہی آزادانہ ان کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔“ اس نے سکون سے اپنی بات مکمل کی۔

”تمہیں بہت مردوں کا تجربہ ہے۔“ عائشہ کو غصہ آیا آخر اے سی صاحب بھی تو مرد ہی تھے۔

”میں ان لوگوں میں سے ہوں جو خود تجربات کرنے کے بجائے وہ مردوں کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو نقصان پہنچنے سے بچا لیتے ہیں۔ ابھی جو اے سی شہر پار دورانی ہر پختے ڈورس لگاتے پہنچ رہے ہیں بعد میں تمہارا منہ انہیں نئے منہ لگا کرے گا اور بلال صاحب تم سے اپنی ایک ایک سی ڈی کا حساب طلب کریں گے۔“

وہ آج ان لوگوں سے اگلے پچھلے تمام حساب چکانے کے موڈ میں تھی۔ اس کی اس بات پر فریال اور عائشہ ایک ساتھ بولنا شروع ہو گئیں۔

”ارے اس نے مسز باجی کا گروپ جوائن کر لیا ہے وہ کل ہی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ مڑا کر جلتے تو ہے پر بھی ہاتھ رکھ کر کہے کہ تم سے محبت کرتا ہے تو بھی یقین نہ کرو۔“

”میں نے کوئی گروپ وروپ جوائن نہیں کیا۔ ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ اتنی ناقص اہقل مخلوق کے لیے جو زلفوں اور آنکھوں کے جھوٹے تصدیق پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی ہو، کون اپنا ہاتھ جلانے پھر پٹال کا خرچہ اٹک لے لہذا یہ تو سوائی مثال نہایت بھونڈی ہے۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولی تو جویریہ اس کے ساتھ مل گئی۔

”اس بات پر تو میں بھی فاطمہ کی تائید کر رہی ہوں۔ مڑ



سے زیادہ بھونکا مکار اور بے وقاس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہوگا۔

”شکریہ میرے حق میں بولنے کا۔ اب یہ سامنے والی میز پر ہی دیکھو۔ وہ ستر سالہ بڑے میاں اپنے پہلو میں پوتی کی عمر کے برابر کی لڑکی کو بٹھائے خود کو پرس آف ویلز سمجھ رہے ہیں اور پوتی صاحبہ کی طرف دیکھتے ہم لوگوں کو دیکھنا بھی نہیں بھول رہے۔“ اس نے سامنے والی میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو عظمیٰ کہنے لگی۔

”سب سے زیادہ غور سے دیکھ بھی تمہیں ہی رہے ہیں۔ یہ بلیک کلر تھر پر سوٹ بھی تو بہت کر رہا ہے اور پھر یہ میک اپ۔“

”ویسے یہ فیکٹ ہے کہ آج ہم سب میڈل سب سے اچھی تم لگ رہی ہو۔“ فریال نے بھی تعریفی کلمات کہے۔

”شکریہ بہت شکریہ۔“ اس نے بڑے میاں کی طرف سے اپنا رخ اس طرح موڑا کہ اب اس کا سائڈ پوز ہی بے مشکل دیکھ پارہے ہوں گے۔

”کیا خیال ہے جاتے ہوئے ذرا تفریح کریں گے بڑے میاں کے پاس جا کر کہیں گے کہ انکل آپ کی پوتی کا کہیں رشتہ تو نہیں ملے ہوا۔ مجھے اپنے بھائی کے لیے یہ بہت پسند آئی ہیں۔“ فریال جیسی پیچنگامہ پرور لڑکی ایسی شرارتوں کی پیشہ روح ہوا ہوتی تھی۔

”خیال تو برا نہیں۔“ عائشہ نے بھی تائید کی۔ ”ہم سب میں سب سے سنجیدہ جویریہ اور فاطمہ ہی ہیں لہذا ان دونوں ہی میں سے کوئی بڑے میاں سے جا کر بات کرے۔ میں تو بات بعد میں کروں گی، ہنسی پہلے آجائے گی۔“ فریال نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

”میں تو کبھی بھی نہ جاؤں اس خبیث بڈھے کے پاس۔ تم لوگ کرو اپنا انجوائے منٹ میں اور جویریہ تو گاڑی میں جا کر بیٹھ رہے ہیں۔“

اس نے صاف انکار کیا اور فوراً ”کھڑی ہو گئی۔ کھڑے ہوتے ہوئے اپنی پچھلی میز پر نظر پڑی تو اس کے اوسان جاتے رہے۔ حلق اور تین دوسرے اقراؤ

ان کے بالکل پچھلی والی میز پر بیٹھے تھے۔ وہ لوگ اپنی باتوں میں کچھ اس طرح مشغول تھیں کہ گرد و پیش کا کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ حسن تو سنجیدہ چہرے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ عمرہ تینوں بڑی دلچسپی سے اس کی سنوری لڑکی کو دیکھ رہے تھے جو مڑوں کے خلاف مسلسل اپنی دوستوں کی برین واشنگ کرتی رہی تھی۔ اسے اٹھنا دیکھ کر بھی ان میں سے کسی نے اس پر سے نظرس نہیں ہٹائی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی جویریہ اور عظمیٰ بھی اٹھ کھیں اور فوراً ”ہی وہ دونوں بھی اسی کی طرح جہنم تھیں۔“

”تم تینوں کو کیا سانب سو گئے گی؟“ انہیں ہکا بکا کھڑے دیکھ کر فریال بھی اٹھ کھڑی تو اس کا بھی یہی حال ہوا۔

زندگی میں پہلی ہی مرتبہ اس کے بارے میں کوئی کنکشن دے رہے تھے اور پہلی ہی بار پکڑی بھی گئی تھی۔ ان لوگوں کو وہیں بت بنا چھوڑ کر وہ باہر نکلنے والے راستے پر چل پڑی۔

کچھ دیر بعد وہ چاروں بھی آکر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ ”کتنا برا ہوا۔ ہم لوگوں کو بولتے وقت آس پاس دیکھ تو لیتا چاہیے تھا۔“ جویریہ نے افسوس کا اظہار کیا۔

”مجھے تو اتنی شرمندگی ہو رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ کیا امپریشن رہا ہو گا اس کا ہم لوگوں کے بارے میں۔“ عظمیٰ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

”تم لوگوں سے زیادہ شرمندگی تو مجھے اٹھانا پڑے گی۔ انٹینیٹیوٹ میں اب اگر کبھی اس کا سامنا ہو گیا تو کتنی شرمندگی ہوگی۔“

فریال کی بات پر وہ جواتی دیر سے چپ بیٹھی تھی بول پڑی ”کس بات کی شرمندگی۔ ہم آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں۔ جس کے بارے میں جو چاہیں بول سکتے ہیں۔“

”پھر بھی اس نے کیا سوچا ہو گا؟“ عائشہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”جو چاہے سمجھتا رہے ہماری بلا سے اور تم لوگوں کا افسوس تو ویسے بھی بڑا فضول ہے۔ تمہیں کیا اس کے

رہنے داری جوڑنی ہے یا کوئی پلاٹ پر مٹ وغیرہ حاصل کرنا ہے جو ایسی شکلیں بنا رہی ہو۔“ اس نے لا پرواہی سے جواب دیا۔

ان لوگوں کو تو ٹوک دیا تھا اور خود اپنے آپ سے بھی کہہ دیا تھا ”آئی ڈیم کیئر“ لیکن انوار کے روز جی سے وہ سخت کونٹینس ہو رہی تھی۔ کسی کو ڈسکس کرنا چاہے بڑے انداز میں سہی اس بات کو تو بہر حال ظاہر کرتا ہے کہ آپ اس شخصیت کو اہمیت دے رہے ہیں اور وہ ناانستہگی میں اسے اہمیت دے گئی تھی۔ وہ تو یہی سمجھا ہو گا کہ میں اکثر ہی فریڈ میں بیٹھ کر اسے ڈسکس کرتی ہوں۔

اس کی آمد کی اطلاع پا کر وہ مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی زردوم میں داخل ہوئی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے سوچ لیا تھا کہ پوچھنا ہی کا مظاہرہ کرنا ہے اس لیے اطمینان سے کھڑی تھی۔

”وعلیکم سلام۔“ کہیں جا رہی ہو؟“ اس نے کمری نگاہوں سے ان کا جائزہ لیا۔

”جی آج جویریہ کی مہندی ہے۔ وہیں جانا ہے۔“ اپنے مہندی کمر کے کاندانی کے دوپٹے کو سنبھالتے جواب دیا گیا۔

”کیسے جاؤ گی۔ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ ”نہیں شکریہ“ ہم لوگ فریال کی گاڑی میں جائیں گے۔“ وہ اس کی خود پر مرکوز نگاہوں سے کچھ بے چین کی ہو کر بولی۔

”اچھا پھر میں چلتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا تو فاطمہ بھی اٹھ کھڑی۔

اپنے کمرے میں واپس آئی تو وہ تینوں اسی کے کمرے میں بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں ”کیا ہوا؟ کچھ کہا اس نے تم سے؟“ سب نے ایک آواز ہو کر سوال کیا تو وہ ہنس پڑی۔

”وہ ہم لوگوں کی طرح فارغ نہیں جواتی فالتو باتیں یاد رکھو۔ ویسے بھی بڑے دلچ کے لوگ اتنی چھوٹی باتوں پر کوئی رائے دینا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔“ اس کے جواب پر وہ لوگ ہاؤس ہو گئیں۔ ”میرا تو

خیال تھا کہ وہ کیٹ کے حوالے سے تمام غلط فہمیاں دور کر کے شاید آج تمہیں پروپوز کر دے۔“ فریال نے منہ نہایا۔

کچھ دیر وہ تینوں اسی موضوع پر اظہار خیال کرتی رہیں۔ پھر جب سب کی تیاری مکمل ہو گئی تو وہ جویریہ کے بھائی کے گھر جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ سبز کاظمی کی اجازت سے وہ چاروں ہی جویریہ کی شادی کے دن تک اس کے بھائی کے گھر ٹھہریں۔ جویریہ کی شادی کے تمام فائنل سٹیز کو ان لوگوں نے بہت انجوائے کیا۔ مصطفیٰ بھی سب کو اٹھا لگا تھا۔ سیدھا سادہ پر بھا لکھا شخص۔ اس کی شخصیت میں دکھلاؤ اور بناوٹ بالکل نہیں تھی۔ اپنی دوست کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر کے وہ لوگ واپس ہاسٹل آ گئیں۔

جویریہ کی کسی سب سے زیادہ اسی کو محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی اس کے کمرے میں کوئی اور لڑکی نہیں آئی تھی۔ مگر اسے پتا تھا کہ کوئی اور لڑکی ابھی گئی تو کبھی بھی جویریہ کی جگہ نہیں لے سکے گی۔ وہ غلط اور محبت کرنے والی لڑکی جو ہر قدم اس کے کام آتی تھی اور کبھی کوئی احسان بھی نہیں بنایا تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی نہیں لے سکتا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

جویریہ کو مس کرتی وہ ان دنوں کچھ زیادہ ہی اداس رہنے لگی تھی۔ اس شام فریال اس کے کمرے میں آئی ”مجھے آفس جانا ہے۔ تم چل رہی ہو میرے ساتھ۔“ اپنی بوریت دور کرنے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ چلی آئی۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتی رہیں۔ موسم بھی اچھا تھا اور پھر گاڑی اور پٹرول بھی ایا کا سو فریال بی بی بڑے موڈ میں فاسٹ ڈرائیونگ کر رہی تھیں۔

”مٹا براہ فیصل جیسی صاف ستھری سڑک پر گاڑی چلانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔“ فریال نے ڈرائیونگ کو انجوائے کرتے ہوئے کہا۔



”ایسا کرتے ہیں کچھ دیر ڈرائیو کر کے کہیں سے مزے دار سا گر اور آکس کریم کھاتے ہیں۔“ اس نے لب کشائی کی۔

”ایڈیا اچھا ہے۔ لیکن بل تم بے کرو گی۔“ فریال کی بات پر وہ ہنس پڑی۔ یونہی ڈرائیو کرتے کچھ دیر گزری ہو گی جب اس کے پاس سے ایک گاڑی تیز رفتاری سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ ایک لمحے سے بھی کم وقفے میں وہ پہچان چکی تھی کہ یہ بلیک سوک کس کی ہے اور برابر والی سیٹ پر بیٹھی لڑکی کون ہے۔ گاڑی ایف بی سی کے سامنے جا کر رک گئی تھی۔ وہ بے ساختہ فریال سے بولی۔

”فریال! ذرا یہاں ایف بی سی کے پاس گاڑی روکو۔ مجھے اپنی ایک پرانی دوست اندر جانی نظر آتی ہے۔“

”شام کے پانچ بج رہے تھے اور بیشتر دفاتر کی اس وقت چھٹی ہوئی تھی۔ ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ فریال کو گاڑی ایف بی سی سے تھوڑی پہلے ہی روک دینی پڑی۔

”ریش بہت ہے۔ گاڑی پھنس گئی تو میری ڈرائیونگ اتنی عالی شان بھی نہیں کہ ٹریفک کے جھوم سے نکال سکوں۔“

فریال بھی اس کے ساتھ ہی گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔ سامنے سے آتے بلال کو دیکھ کر فریال اس سے ہائے بیلو میں مصروف ہو گئی۔ وہ ان لوگوں کے گاڑی روکنے سے بھی کافی پہلے اندر جا چکا تھا۔ جبکہ شفق گاڑی ہی میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ فریال کی گاڑی اس کی گاڑی سے بہت دور کھڑی تھی۔ اس لیے اتنے ریش میں اسے اپنے دیکھ لے جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے واپس آتا نظر آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے اس نے کسی بھی طرف دیکھے بغیر گاڑی اشارت کر دی تو وہ فریال کی طرف متوجہ ہوئی جو گروڈ پیش سے بے نیاز بلال سے باتوں میں مگن تھی۔

”فریال! میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ اس

نے اسے مخاطب کیا تو وہ مصروف انداز میں بولی۔

”ہاں ہاں! جاؤ، کوئی بات نہیں۔“ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہتی ہے مگر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اندر جائے اپنے دل کی مانتی وہ اندر چلی آئی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ یونہی کسی کام سے یا کسی سے ملنے یہاں آیا ہو مگر اسے لگ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر بعد اس کے شپے کی تھوڑی سی گھنٹی بجی۔

ذرا سی کوشش کے بعد وہ ایف بی سی کے فور تھ فلور پر واقع اس چھ کمروں کے شاندار دفتر میں کھڑی تھی۔ جو اس کے کزن حسن عباس کا تھا اور جہاں سے مختلف فرمز، بینکوں اور دیگر کاروباری اداروں کو کمپیوٹر سسٹم فروخت کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر سسٹمز کرنا اور سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر سے متعلق تمام امور میں بھی وہاں ڈیل کیا جاتا تھا۔ وہ ایک سرسری سی نظروں سے ڈال کر باہر نکل آئی۔ وہاں پر واقع بہت سے دفاتروں میں سے مختلف لوگ آف ہونے پر نکل رہے تھے۔ اسی لیے گھبراہٹ اور شور شراب کچھ زیادہ ہی تھا۔ اسی وقت اس نے اپنے سے آگے چلتی دو لڑکیوں کو

باتیں کرنا سنا۔

”یہ حسن عباس آج کل شفق شاہ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی دیکھے جا رہے ہیں۔“ ان میں سے ایک بولی تھی۔ دونوں ہی ملازمت پیشہ معلوم ہو رہی تھیں۔

”ساتھ ساتھ کیا تمہیں نے تو سنا ہے کہ ان لوگوں کی انجینئرنگ بھی ہو گئی ہے۔ وہ حرا نہیں ہے جو حسن عباس کے ہاں ٹیلی فون آپریٹر ہے۔ مجھے بتا رہی تھی کہ شاید اگلے مہینے وہ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔“ دوسری نے جواب دیا تو پہلی مسکراتے ہوئے بولی۔

”خیر کپل تو اچھا ہے۔ دونوں ایک ساتھ اچھے لگیں گے۔“

وہ دونوں ہنستی مسکراتی باتیں کرتی کافی دور چلی گئی تھیں جبکہ وہ وہیں کھڑی تھی۔ بتا نہیں بعض دفعہ آپ جن باتوں کے ہونے سے پہلے ہی ان سے واقف ہوتے ہیں اور آپ کو اس بات کی کچھ خاص پروا بھی نہیں ہوتی مگر جب وہ بات اصل میں ظہور پزیر ہوتی

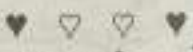
ہے تو آپ کی سرری حقیقت پسندی وحری رہ جاتی ہے۔

”وہ کبھی بھی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ شادی کے لیے تو کوئی بھولی بھالی معصوم سی لڑکی منتخب کی جائے گی۔“

اسے اپنے کے الفاظ یاد آئے اور شاید اس وقت معصوم لڑکی کے طور پر اس کے ذہن میں اپنا ہی چہرہ آیا ہو گا۔ اس سے تمام تراخاوقات کے باوجود اسے شاید لا شعوری طور پر یقین تھا کہ ایک دن وہ اسے گھر واپس لانے کے لیے گئے گا اور وہ اس کے پیچھے چل دے گی۔ آج سے پہلے اپنی یہ تمام کیفیات خود اس سے مخفی تھیں۔ اس کا تو خیال تھا کہ وہ حسن عباس سے شدید نفرت کرتی ہے۔ مگر آج پتا چلا تھا کہ نفرت تو شاید ایک دیکھاوا تھا۔ وہ تو درحقیقت اپنے بلائے جانے کی منتظر تھی۔ اپنے بار جانے کا خود سے ہی شکست کھا جانے کا ماتم کرتی وہ پیچھے چلی آئی۔

فریال اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ ”کیا ہوا مل گئی تمہاری دوست؟“

اس کے سوال پر اس نے گردن ہلا دی۔ پھر بتا نہیں سارے راستے فریال کیا کیا کہتی رہی اور وہ کیا جواب دیتی رہی اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔



”موزنگ تم پر ہر رخ سے مہمان ہے۔ تم مٹی میں ہاتھ ڈالتے ہو وہ سونا بن جاتی ہے۔ تم نے زندگی میں وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس کا تم نے اور تمہارے ماں باپ نے خواب دیکھا تھا۔ دولت، عزت، رتبہ، معاشرے میں باوقار مقام اور ایک خوب صورت شریک سفر، تم نے سب ہی کچھ پال لیا۔ ٹھیک کہا تھا تم نے تمہاری زندگی کی ترجیحات میں میرا کوئی ذکر نہیں اپنی خوش فہمیوں پر ہنسنے کا چاہ رہا ہے، کتنے آرام سے میں یہ سپاٹ اور بے رنگ زندگی ایک انتظار میں بیٹھی گزار رہی تھی۔ بظاہر اپنی دوستوں کو اور خود کو بھی تھکا کر اندر ہی اندر نہایت پر امید تھی اور بہت سی تجویزوں کی طرح ہمیں اپنے ماں باپ سے خوش قسمتی یا

بد قسمتی بھی وراثت میں ملتی ہے۔ کچھ بچے اچھی شکل صورت، کچھ ذہانت اور کچھ دولت جائیداد وراثت میں پاتے ہیں۔ میں نے وراثت میں اپنی ماں کی بد نصیبی لی۔ میری ماں کی سیاہ بختی میرے جینز میں شامل ہو گئی۔ لیکن میری ماں تو شاید مجھ سے پھر بھی بہتر تھی اس کے مرنے پر کم از کم دو چار افراد نے تو آنسو بہائے تھے۔ آج اگر میں مرجاؤں تو میری موت پر تو شاید کوئی ایک آنکھ بھی نہ برے۔ میری زندگی شاید اس جیلے کی عملی تفسیر ہے۔

”وہ پیدا ہوئی، اس نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے اور وہ مرنے لگی۔“

جویریہ چلی گئی۔ عائشہ اور فریال بھی تعلیم مکمل کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گی۔ عظمیٰ بھی اپنے بھائی کی تعلیم مکمل ہونے پر یہاں سے چلی جائے گی اور میں ساری زندگی یہیں گزار دوں گی۔ مجھے لینے کبھی کوئی نہیں آئے گا۔ ایک لاوارث اور بے نام و نشان لڑکی کو لینے کوئی آئے بھی کیوں۔ سال گزرتے رہیں گے یہاں لڑکیاں آتی اور جاتی رہیں گی مگر ایک بے حد معمولی اور عام سی لڑکی تمام عمر یہیں رہے گی۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہیں آئے گی۔ وہ روز صبح اٹھ کر اپنے لیے رزق حاصل کرنے نکلے گی تو پیچھے کوئی اس کے لیے دعائیں کرنے والا نہیں ہو گا۔ سارا دن محنت مزدوری کر کے وہ شام کو تھکی باری آئے گی تو کوئی مسکراتے لبوں سے ساتھ اس کا منتظر نہیں ہو گا۔ اس کی زندگی کا ہر دن ایک سا ہو گا۔ زندگی اس پر کبھی مہمان نہ ہو گی۔ اس کی زندگی میں کوئی چھاؤں نہیں ہو گی اور ایک دن زندگی سے لڑتے لڑتے وہ یونہی مرجائے گی۔ اماں کی رانی جس کے لیے انہیں یقین تھا کہ سپنوں کی گمری سے کوئی راج کمار آ کر اسے اپنے ساتھ اونچے اونچے محلات میں لے جائے گا۔ وہی رانی جب کفن اوڑھے گی تو کوئی ایک شخص بھی اس کے لیے نہیں روئے گا۔“



تین دن بخار میں پھنک کر وہ خود ہی ٹھیک ہو گئی۔



اپنی وحشت بڑی پر اسے خود ہی ہنسی آئی۔ فریال عاتقہ اور عظمیٰ نے اس کا بہت خیال رکھا تھا مگر وہ اب ان باتوں سے بھلنے والی نہ تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے میں بھی وہ پہلے جیسی گرم جوشی نہیں رہی تھی۔ وہ لوگ اسے اس کی طبیعت کی حجابی سمجھ کر نظر انداز کر گئی تھیں۔

ہر اتوار اسے پیغام ملتا، ”آپ کے کزن آئے ہیں۔“ وہ کبھی کہتی۔

”کہہ دو سو رہی ہیں“ کبھی ”کہہ دو کہیں گئی ہوئی ہیں یا نہ رہی ہیں۔“

اسی طرح کرتے پڑنے مہینہ ہو گیا تھا۔

اس روز اتوار نہیں تھی جب اسے پیغام ملا کہ سمر کاظمی آپ کو اپنے دفتر میں بلا رہی ہیں۔ وہ ان کے بلاوے کی نوعیت سوچتی تھی اتر گئی۔ عموماً ”سمر کاظمی کسی لڑکی کو ڈانٹنے یا تنبیہ کرنے کے لیے اپنے آفس بلاتی تھیں اور وہ ان کی بڑی پسندیدہ تھی۔ اس کی تو وہ دوسری لڑکیوں کو مثال دیا کرتی تھیں کہ لڑکیوں کو ایسا ہونا چاہیے۔ اپنے آپ کو چھپا کر باہر نکلو اپنی نمائش مت کرو۔ کسی وجہ سے نوکری کرنی بھی پڑ رہی ہے تو مردوں کو دعوت نظر دے تو مت دو۔ سو وہ اسے ڈانٹنے کے لیے تو بلا نہیں سکتی تھیں۔

ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اسے آتا دیکھ کر بولیں ”آؤ بیٹا! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“

اس کی نظر سمر کاظمی کی میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے اس شخص پر جمی تھی جیسے وہ اب زندگی میں دوبارہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس پر نظر ڈالے بغیر سمر کاظمی کی طرف متوجہ رہا۔ اسے وہیں سے دیکھ کر وہ بولیں۔

”رک کیوں گئیں۔ آؤ بیٹھو، تمہارے لیے تو خیر بہت خوشی کی بات ہوئی۔ لیکن ہم لوگ تمہیں بہت مس کریں گے۔“

وہ ان کی بات کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اب حسن سے مخاطب تھیں۔

”بہت ہی پیاری عادات ہیں اس بیٹی کی۔ میں گھر جانے کی اجالا کروے گی۔ ماؤں کی اچھی تربیت عیس ظاہر ہوئی ہے۔ ایسی نیک اولاد تو ماں باپ کے لیے سرمایہ افتخار ہوتی ہے۔“

وہ اپنی اس بے موقع توصیف کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ حسن نے اس پر ایک نظر ڈال کر صرف مسکراتے پر اکتفا کیا تھا۔ اسی وقت ان کے گھر سے بلاوا آیا تو وہ ان دونوں سے معذرت کرتی اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ اسے اشتیاق دیکھ کر وہ بولا۔

”بیٹھ جاؤ۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔“

اس کی بات نظر انداز کر کے وہ آگے بڑھی تو وہ غصے سے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

”ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔“ وہ اس کے آگے بٹ کر کھڑا ہو گیا تو اسے رکنار ڈا۔

”چلو، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“ اس نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کہاں؟“ اس کا لہجہ طعنے تھا۔

”گھر اور کہاں“ میں تمہیں گھر لے جانے آیا ہوں۔ کافٹن میں چار کمروں کا اپارٹمنٹ لیا ہے میں نے بے تو کرائے کا“ اللہ نے چاہا تو اپنا ذاتی مکان بھی خرید لیں گے۔ اتنے دنوں سے اسی کی تک وہ میں مصروف تھا۔ وہاں کا انٹریم تمہیں بہت پسند آئے گا۔“

وہ اس کا طنز نظر انداز کر کے بڑے خلوص سے بولا۔

”مجھے بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو بتانا پڑ رہا ہے کہ آپ کی ان باتوں پر مجھے ہنسی بھی نہیں آ رہی۔ ویسے اگر یہ مذاق ہے تو نہایت فضول ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بڑی نفرت سے بولی۔

”دیکھو لڑائی جھگڑے کے لیے سمر کاظمی کا آفس ہرگز بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے تمام جھگڑا گھر پہنچ کر کرنا۔“ وہ سکون سے بولا۔

”میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی سے خاص خاص سامان لے آؤ۔ باقی چیزیں بعد میں آجائیں گی۔“

”آپ نے مجھے سمجھا ہوا کیا ہے؟ آپ کہیں گے“ میرے گھر سے نکل جاؤ“ میں نکل جاؤں گی۔ آپ کہیں گے“ واپس چلو میں چلی جاؤں گی۔ مسٹر حسن عباسی! میں کوئی کٹھ پتلی نہیں ایک جیتی جاگتی انسان ہوں اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ اگر میری اب تک کی زندگی کے فیصلے دوسرے لوگ کرتے رہے ہیں تو اب بھی ایسا ہی ہو گا۔ یہ میری زندگی ہے“ اسے میں اپنی مرضی سے گزاروں گی۔ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ میں خود کروں گی۔“

وہ بڑے تحفے سے بولی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے بولا ”تمہیں مجھ سے جو شکایتیں ہیں وہ سب گھر پہنچ کر کر لیتا۔ یہاں یہ بات کرنا درست نہیں ہے۔“

”کون سے گھر کی بات کر رہے ہیں آپ؟ وہ جس میں آپ اور آپ کی مغرور حسینہ رہتے ہیں اور جس میں اماں کے سر کا صدقہ یا کسی وعدے کا ایفا کرنے کے لیے مجھے لے جایا جا رہا ہے۔ سوری سر! مجھے کسی پرانے گھر میں تیسرے درجے کا شہری بن کر رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے چبلی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔

اسے چپ کھڑا دیکھ کر وہ مزید بولی ”وہ گھر جس میں میں نے اپنی زندگی کے بہت سے سال گزارے۔ میری اماں مجھے اپنی جان سے بھی پیاری ہیں اور اب جس گھر کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ خالفتا“ آپ کا ہے۔ وہاں جانے سے بہتر میں مرجانا سمجھتی ہوں۔“

وہ چپ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا جو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی نفرت کا اظہار کر رہی تھی۔

”اور آپ براؤ مہلانی میرے پیچھے آنا چھوڑ دیجئے“ روز قیامت اگر اماں نے آپ سے اپنے وعدے کے بارے میں باز پرس کی تو میں آپ کی طرف سے گواہی دے دوں گی کہ آپ نے اپنا وعدہ پوری دیانت داری

سے نبھایا ہے اور جب میں خود ہی آپ سے کہہ رہی ہوں تو کسی وعدے کی پاس داری کی کوئی ضرورت باقی نہیں بچی۔ میں عرصہ ہوا اس بات پر مجھوٹا کر چکی ہوں کہ میں دنیا میں اکیلی ہوں اور اب مجھے اس بات پر کوئی غم بھی نہیں ہو گا۔ لہذا آپ اطمینان سے اپنی زندگی گزار لیے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھی تو حسن نے اسے روکا نہیں۔

کمرے میں آ کر وہ کتنی دیر تک اپنے اعصاب کو پُر سکون کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنی من پسند ہنسی سے شادی کر لی۔ خوب صورت گھر اور حسین شریک سفر ایسے میں اپنی خوشیوں کی خیرات سمجھ کر ایک حقیر سی لڑکی کو اپنے گھر میں جگہ دینے کے لیے راضی ہو گئے۔ وہ اب کبھی بھی رونا نہیں چاہتی تھی ”اس لیے اپنی آنکھوں کو گور گور کر گڑ گڑ کر صاف کرنے لگی۔

♥ ♥ ♥ ♥

اس بات کو بمشکل پندرہ دن گزرے ہوں گے کہ ایک بہت ہی انہونی ہو گئی۔ وہ حسن کو انکار کر کے دوبارہ بڑے سکون سے ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ چا نہیں حسن نے سمر کاظمی سے کیا تھا کہ انہوں نے اس سے یہاں سے جانے کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اپنی دوستوں سے اس بات کا اس نے سرے سے ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ فریال وغیرہ البتہ اس بات پر حیران تھیں کہ حسن اتوار کو آیا کیوں نہیں۔ ان کے سوال جواب سے تنگ آ کر اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ آج کل پاکستان میں نہیں ہے۔

حادثہ جیتہ جو عبید صاحب کے پاس اپنے کسی کام سے آیا تھا، قافلہ نے اسے بڑے سرسری انداز میں دیکھا تھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ آفس بنا ہوا کچھ اس نوعیت کا تھا کہ عبید صاحب کے کمرے میں جانے کے لیے لازمی اس جگہ سے گزرتا پڑتا تھا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھی چھ میزوں پر وہ اور دیگر پانچ افراد کام کرتے تھے۔ صبح سے



شام تک وہاں بے شمار افراد آتے جاتے تھے۔ ایسے میں کسی شخص کو خاص طور پر توجہ سے دیکھنا یا یاد رکھنا برانا ممکن سا کام تھا۔

مگر جو بات اہم ہوتی تھی وہ حادثہ جبر کی اگلے روز دوبارہ آمد تھی۔ آج وہ عید صاحب کے آفس میں جانے کے بجائے اس کی ٹینک کے سامنے آکر کھڑا ہوا گیا تھا۔ بڑے مذہب انداز میں بیٹھنے کی اجازت طلب کی گئی تو اس نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔ وہ ایک پینتالیس چھیالیس سال کا خوبصورت تھا۔ اپنی ڈریسنگ اور بے حد پر اعتماد انداز سے وہ کوئی بہت وکیل آف شخص معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ایسے کسی شخص کا خاص طور پر اپنی طرف متوجہ ہونا سمجھ نہ پائی۔ کچھ دیر وہ اس سے رسمی سی باتیں کرتا رہا۔ ان کا اپنا گروپ آف پینتالیس چاروں بھائی مل کر کاروبار سنبھالتے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ اسے اپنے بارے میں بتاتا رہا اور پھر بغیر اس سے اس کے بارے میں کچھ پوچھنے وہاں سے چلا گیا۔ وہ اس کے اپنی جانب متوجہ ہونے اور پھر آگرمات کرنے کی وجہ بالکل بھی نہیں سمجھ پائی تھی۔ کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد بھی جب کوئی سراہا تھا نہ لگا تو سر جھٹک کر گئے کیا کہہ کر بے فکر ہو گئی۔

دو روز بعد اس نے حادثہ کی فون کال اپنے آفس ہی میں دیکھ لی۔ وہ اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے فاطمہ کے اندر چھپے ٹیلنٹ کو پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا تھا اور اتنی اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک لڑکی اپنی معمولی ملازمت کرتی کچھ سمجھتی نہیں۔ اسے تو کسی اعلیٰ شان آفس میں ایگزیکٹو پوسٹ پر کام کرنا چاہیے۔ اتنے عرصے سے زندگی کی دھوپ چھاؤں سے رہی تھی۔ روزانہ بے شمار مریوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ مریوں کی نظریں بہت اچھی طرح پہچان لیتی تھی۔ پہلے ہی روز اس نے یہ بات تو محسوس کر لی تھی کہ حادثہ جبر اسے کس نظر سے دیکھ رہا ہے مگر وہ اسے ایک شوقین مزاج مری کی نظریں سمجھ کر نظر انداز کر گئی تھی۔ مگر اب جو جواب کی آفر ہوئی جو کہ اسے پتا تھا کہ اس کی کس صلاحیت کی

وجہ سے اسے مل رہی ہے۔ وہ سوچ میں پڑی۔ اس نے دو ٹوک انداز میں منع کرنے کے بجائے اس نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔

رات بھر سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے اس موقع کو گنونا نہیں چاہیے۔ کیا ساری اقدار اخلاقیات اور شرافت کے تمام معیار صرف اسی کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس بار ”کسی“ کی ضد میں وہ کسی بھی حد تک جاسکتی تھی۔ بہتر معیار زندگی اختیار کرنا اس کا بھی حق ہے اور جب خوش قسمتی خود چل کر دروازے تک آگئی تو شخص کسی دنیاوی شوقی سوچ کے تحت اسے لوٹا دینا نہایت احمقانہ اقدام ہو گا۔ وہ کسی بھی وجہ سے جا ب آفر کر رہا ہے اس کا تو فائدہ ہی ہے۔ وہ کسی کو تباہی کی کہ ترقی اور کامیابی صرف اسی کا حق نہیں۔ وہ بھی اسے حاصل کر سکتی تھی۔ اس نے کسی سے بھی کوئی مشورہ کیے بغیر صبح ہی حادثہ کو فون کر کے اپنی رضامندی دے دی۔ وہ شاید توقع بھی کسی ایسے ہی جواب کی کر رہا تھا۔ اس لیے زیادہ حیران بھی نہیں ہوا۔

وہ ایک ہی جست میں بہت اونچائی پر پہنچ گئی تھی۔ بائیس ہزار تنخواہ، ”پک اینڈ ڈراپ“ کے لیے بہترین گاڑی اور ڈرائیور اور اس کے علاوہ بھی کئی مراعات تھیں۔ اب اسے دیکھنوں کے دھکے نہیں کھانے پڑیں گے۔ وہ بھی قیمتی کپڑے پہن سکے گی۔ ضروری نہیں کہ اگر وہ غریب پیدا کی گئی ہے تو غریب ہی مر بھی جائے عید صاحب کو اسے معافی دیا تو وہ اس کے یوں ایک دم ملازمت چھوڑ دینے پر حیران ہوئے۔ اس نے انہیں بتا دیا کہ اسے کہیں اور بہتر ملازمت مل گئی ہے۔ اس لیے وہ وہاں جوائن کر رہی ہے۔ کہاں لی ہے یہ پتے کی اس نے ضرورت محسوس نہ کی۔ حادثہ کا آفس جوائن کرنے سے ایک روز پہلے وہ فریال کے ساتھ ڈبلیکس چلی آئی۔ فریال ہر مہینے بڑے پابندی سے پار لریا پر جلیا کرتی تھی۔ اسے اپ نوٹیٹ رہنے کا شوق تھا۔ اس کے ساتھ چلنے کی بات پر وہ بہت خوش ہوئی اور بولی۔

بہت اچھا کر رہی ہو۔ میں تو خود کھتی ہوں کہ ہر انسان کو بہتر سے بہتر نظر آنے کا حق ہے۔ جو لڑکیاں بڑے مسائل سے رہتی ہیں اور بہت حسین نظر آتی ہیں ان میں سے خدا داد خوب صورتی شاید ایک آدھ ہی کے پاس ہو۔ سب اپنے آپ پر توجہ دے کر خوب صورت نظر آتے ہیں۔ تمہیں بھی اگر اپنی پرستاشی کو گروم کرنے کا خیال آیا ہے تو یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔

بالوں کی لیئر کٹنگ کروا کر ان میں اسٹریکٹنگ کروائی۔ کئی بو، فیشل اور مینی کیور پیڈی کیور وغیرہ کروا کر جب وہ ڈبلیکس سے پار لگی تو ایک بدلی ہوئی فاطمہ عارف تھی۔ اس کے تصور میں کسی کا ہر لہا بہ لہا رہا تھا جو ہر وقت اسے چھیچھ کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ہائل آکر اس نے آئینے کے آگے کھڑے ہو کر کتنی ہی دیر تک اپنا جائزہ لیا۔ ذرا سی توجہ دینے کی دیر تھی۔ وہ اپنے ہی آپ کو بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ لا شعوری طور پر اپنا موازنہ کسی کے ساتھ کر رہی تھی۔ کوئی بڑی ادا سے بالوں کو شانوں پر جھٹک کر اسے چھیچھ کر رہا تھا۔ اسے لگا۔ آج وہ اس مقابلے کی دعوت دینی لڑکی سے زیادہ حسین لگ رہی ہے۔

بہترین تراش خراش کا دیدہ زیب لباس پہن کر وہ پہلے روز اپنے آفس گئی تو حادثہ نے بڑی خوش دلی سے اسے ویلکم کیا۔ اس کی تبدیلی کو بہت سراہا۔ اس کی تعریف اور خود پر مرکوز اس کی نگاہیں اسے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ مگر وہ اپنی اس کیفیت پر خود ہی کو ڈانٹ رہی تھی۔

”رہی میں وہی گنوار کی گنوار اور پینڈو“ میرا خیال ہے مجھے اب اس شر کے طور طریقے سیکھ ہی لینے چاہیں۔ یہ نام نہاد شرافت صرف اور صرف ایک دھوکہ ہے۔ درحقیقت ایسی ہی لڑکیوں کی حیثیت ہے جو خود کو سجا کر سنوار کر رکھیں ہونہ، ”ساوی“ شرافت اقدار سب رائے زمانے کی باتیں ہیں جو صرف کتابوں ہی میں اچھی لگتی ہیں۔“

اپنے آپ کو ہر طرح تبدیل کرنے کے باوجود بھی وہ

اپنے دوپٹے کو سر کی طرح گردن میں نہیں ڈال پائی تھی۔ بے حد فٹنگ کے خود کو ظاہر کرتے کپڑے نہیں پہن پائی تھی۔ گہرے نگے اور ہاف سیلوز بھی نہیں پہن پائی تھی۔ شاید اماں کی تربیت اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ لہذا اپنی تمام تر تبدیلی کے باوجود اس کا لمبا جوڑا اوپٹ جس نے اس کے وجود کو چھپایا ہوا تھا۔ اپنی جگہ پر قرار تھا۔ اپنے خوب صورت سے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بیٹھ کر اس نے خود کو بہت معتبر محسوس کیا۔ اس کے آفس جوائن کرنے کی خوشی میں حادثہ نے اسے اپنے آفس میں لے کر گویا اور کام کی نوعیت کے بارے میں بتایا۔

دوسرے دن وہ ابھی آکر اپنے آفس میں بیٹھی ہی تھی کہ کوئی بڑی بد تمیزی سے دروازے کو دھماکے سے کھولا اندر چلا آیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو غصے سے لال پیلا چہرہ لیے حسن اور اس کے پیچھے اس کا بیون کھڑا تھا۔

”مذہم! میرے روکنے کے باوجود یہ صاب زبردستی اندر گھس آئے ہیں۔“ وہ اپنی متوجہ ڈانٹ پھینکار سے ڈر کر وضاحت کرنے لگا۔ اس کے کچھ جواب دینے سے پہلے حسن اس کے سامنے کرسی ٹھیک کر بیٹھ گیا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر اس نے سکون سے بیون سے کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ جانیں۔“ وہ بے چارہ جلدی سے پار لگی۔

”فرمائیے،“ کیسے آتا ہوا؟“ اس نے اطمینان سے پوچھا۔ نگاہوں میں تسخیر اور مقابل کے لیے چھیچھ تھا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر اسے گھورتا رہا۔ جبکہ وہ اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر آرام سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

”بہت خود مختار ہو گئی ہو تم۔ تمہارے خیال سے میں نے تمہیں اتنی آزادی دے دی ہے کہ تم جو مرضی کرتی پھو اور میں خاموش تماشا بنی بنا دیکھتا رہوں۔“ وہ غصے سے چیخ اٹھا تھا۔ ”آج تک اگر تمہاری کسی بات پر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو



اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں ایک روشن خیال اور لبرل آدمی ہوں۔ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر جواب کرنا۔ میں جب رہا کہ چلو ایک تجربہ ہی سہی اور پھر وہاں کا ماحول بھی اچھا تھا۔ لیکن اپنی تمام تر لبرل سوچ کے باوجود میں اتنا آزاد خیال بھی نہیں کہ تم اپنی من مانی کرو اور میں تمہیں روک نہ سکوں۔ فاطمہ صاحبہ! مجھے اپنی مشرقی روایات اور اپنا اس معاملے میں کنزربو ہونا بڑا عزیز ہے۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر غرا ہوا تھا۔

”آپ کا اتنا غصہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں نے آپ کو اپنے ذاتی معاملات میں بولنے کی اجازت تو ہرگز بھی نہیں دی۔ میرے ہی آنکس میں بیٹھ کر مجھے دھمکیاں دینے والے آپ ہیں کون؟ صرف ایک کرنہ معاف کیجئے گا میں نے آپ کو ایسا کوئی حق نہیں دیا کہ آپ میری ذاتیات میں مداخلت کریں۔“ اس کے غصے کا جواب بڑے سکون سے دے کر وہ براہ راست اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

”میں تمہارا سر پرست ہوں اور تمہیں کسی بھی غلط کام سے روکنا میرا فرض ہے۔“ اب کے وہ اپنے غصے کو کنٹرول کر کے کچھ دیر انداز میں بولا۔

”میں ایک حائل‘ بالغ اور باشعور لڑکی ہوں۔ مجھے کسی گارجنین کی ضرورت نہیں۔“ وہ انگلی اٹھا کر ٹوکنے والے انداز میں بولی۔

”ویسے آپ کا مسئلہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو کس بات سے تکلیف ہو رہی ہے۔ ایک ایسی لڑکی جسے ساری زندگی آپ اپنا دوست ٹکرو کھنا چاہتے تھے شاید اپنی انا کی تسکین کے لیے اس نے بڑے اطمینان سے آپ کے حصار سے نکل کر اپنی زندگی خود جیتی شروع کر دی ہے اور یہ بات آپ کو تکلیف دے رہی ہے کہ کل تک جو میری محتاج تھی۔ آج میرے مقابل کیسے آگئی۔“ وہ استہزائیہ لب و لہجہ اختیار کر گئی تھی۔

”فاطمہ! تم پاگل ہو گئی ہو۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے یہ نوکری تمہیں تمہاری

کسی صلاحیت کی وجہ سے ملی ہے یا یہاں پر بڑے بڑے ڈگری ہولڈرز‘ تجربہ کے سرٹیفکیٹ ساتھ لیے نوکری کے لیے جوتیاں چنگٹے پھرتے ہیں اور معمولی سی نوکری بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ تمہارا کیا خیال ہے تم میں سرخاب کے پر لگے ہیں کہ کسی غیر معمولی کوالیفیکیشن‘ تجربے اور سفارش کے بغیر تمہیں اتنی اچھی جاب مل گئی ہے۔ یہ ممکن کس طرح عورتوں کو ایک پلاسٹ کرتے ہیں۔ تمہیں کچھ نہیں پتا تم جیسی بیوقوف لڑکیاں تو دیتے بھی آسان ترین شکار ثابت ہوتی ہیں۔“ وہ اب اسے سمجھا رہا تھا۔ ”تم تو شکل سے ہی اتنی معصوم اور سیدھی سادی نظر آتی ہو اور مردوں کو ایسی لڑکیاں بہت اٹریکٹ کرتی ہیں۔ ساری دنیا کی عورتوں کا تو میں نے ٹھیکہ نہیں اٹھالیا۔ لیکن اپنے گھر کی عزت کی حفاظت کرنا مجھے خوب آتا ہے۔“ وہ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں یہاں کوئی سین کر نیٹ نہیں کرنا چاہتا اس لیے تمہیں پہلی اور آخری وارنگ دے کر جا رہا ہوں کہ آج ہی یہاں سے ریٹائرمنٹ کر دو۔ آج کے بعد تم مجھے کبھی اس دفتر میں نظر آئیں تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا اور اسے صرف دھمکی مت سمجھنا میں جو کہتا ہوں وہ کرتا بھی ہوں۔ امید ہے میری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔“

وہیں کھڑے کھڑے اسے نرم الفاظ میں وارننگ دی اور پھر دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن شدید ترین غصے کی اس لہر کو وہ روک نہیں پاری تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

مختلف لوگوں کی مختلف ہائیز ہوتی ہیں۔ حارث جینہ کی ہالی خوب صورت لڑکیاں تھیں۔ شادی شدہ وہ بچوں کا باپ ہونے کے باوجود اس میں لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ اس کی بے تحاشا دولت‘ اسٹیشن اور مروانہ وجاہت ایسے ہتھیار تھے کہ لڑکیاں خود بخود ہی اس کی طرف کھینچی

چلی آئی تھیں یہ اور بات کہ کسی بھی لڑکی کے ساتھ اس کا تعلق چند ماہ سے زیادہ نہ رہتا تھا۔ زیادہ تر لڑکیاں اسی کی طرح ابر کلاس سے تعلق رکھتی تھیں اور جان بوجھ کر اس کے نزدیک آتی تھیں۔ عورت کی حیثیت اس کے نزدیک ایک کھلوے سے زیادہ نہ تھی۔

عبید وارنی کی ٹریول ایجنسی میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی اس لڑکی نے اسے پہلی ہی نظر میں چونکا دیا تھا۔ وہ اب تک تقنی ہی لڑکیوں سے دوستیاں کر چکا تھا اور یہ دوستیاں اخلاقیات کی تمام حدود بھی پار کر چکی تھیں مگر اس لڑکی میں کچھ ایسا تھا کہ وہ مبسوت رہ گیا۔ وہ کوئی آسمان کی جوہر پری نہیں تھی مگر پھر بھی کوئی بات تھی جو غیر معمولی تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا لگا جیسے کوئی معصوم سی ہنی کسی جنگل سے بھٹتی اتفاقاً اس شہر میں آگئی ہے۔ اس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ وہ اسے کبھی ہی دیر دیکھتا رہا تھا۔ اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں حسن ہر رنگ میں دیکھا اور پرتا تھا مگر ایسی معصومیت اور پاکیزگی اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ بے اختیار اسے تسخیر کرنے کی خواہش اس کے دل میں ابھری تھی۔ اپنی اس خواہش کے پیش نظر وہ اس کے پاس پہنچ گیا اور تھوڑی ہی دیر بات کر کے اندازہ ہو گیا کہ اسے تسخیر کرنا تھوڑا مشکل سی پرنا ممکن نہیں۔

اس لڑکی کا مسئلہ معاشرے میں باعزت مقام اور اچھی نوکری حاصل کرنا تھا۔ سو اسے اپنے ہاں کام کرنے کی آفر کر دی۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ مان گئی تھی۔ وہ اس کی اب تک کی تمام دوستوں سے مختلف تھی سو اس نے بھی اپنا رویہ بڑا محتاط رکھا تھا۔ وہ جلد بازی میں کام کا ٹیٹا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی صرف اپنے اوپر پڑنے والی نظروں کو ناپسند کرتی تھی مگر وہ غاموٹی رہتی تھی۔ سو وہ فی الحال اس سے دور اور صرف کام کی بات کرتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ شکار کچھ مشکل ہے لیکن اسے مشکل کام کرنے میں مزہ آتا تھا۔

حسن کی دھمکی کو نظر انداز کر کے وہ اگلے روز بھی آفس آگئی اور بڑے مطمئن انداز میں اپنا کام کرنے لگی۔ سچ نام میں حارث اس کے کمرے میں آیا اور بولا۔

”آپ لپکھاں کریں گی؟“ اس نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولی۔

”میں لپکھنے لے کر آتی ہوں۔“

”ساتھ لایا ہوا لپکھی اس کو کھلا دیجئے گا۔ آج آپ میرے ساتھ لپکھیں کریں۔“ وہ اس کی میز کے سامنے کھڑا مسکرا کر بولا۔

بے اختیار منع کرنے سے اس نے اپنے آپ کو روکا۔ اسے آنکھن میں جھٹلا دیکھ کر وہ ہنسنے ہوئے بولا۔

”یقین کریں میں بہت اچھا میزبان ثابت ہوں گا۔“

اپنے آپ سے جنگ کرتی وہ آخر کار کھڑی ہو گئی تو اس کے اندر کوئی اسی سے ناراض ہو گیا۔ دل سے آواز آرہی تھی کہ یہ ٹھیک نہیں ہے اس تنبیہ کو نظر انداز کرتی اس کے ساتھ باہر نکل گئی جبکہ حارث جینہ اپنی اس کامیابی پر سرشار تھا۔

پارکنگ ایریا میں آکر وہ اپنی گاڑی کا لاک کھولنے لگا اور وہ دوسری طرف کے دروازے کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت ایک گاڑی انتہائی تیز رفتاری سے فاطمہ کے پاس آکر رکی۔ اگر وہ فوراً ہی دو قدم پیچھے نہ ہٹ گئی ہوتی تو گاڑی کے ٹائرس کے پیروں کو چپکتے ہوئے بریک لگاتے گاڑی کا دروازہ کھول کر اترتے حسن کو دیکھ کر ایک لمحہ کو تو وہ کلب گئی۔

ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ اس کے سامنے آگیا اور آتے ہی ایک زور دار پھٹراس کے منہ پر مارتے ہوئے بولا۔

”کہا تھا ناں۔ دیکھا یہاں نظر آئیں تو ناٹکیں توڑ دوں گا۔“ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے وہ اسے دیکھتی رہ گئی جو انتہائی مشتعل نظر آ رہا تھا۔

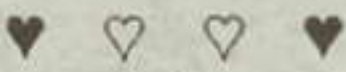
”مسٹر! آپ کون ہیں اور یہ کیا حرکت ہے؟“



اس کے سر پر کھڑا چیخ رہا تھا۔ ”شرم آرہی ہے مجھے تمہیں اپنی کزن کہتے ہوئے۔ شکر ہے آج اماں نہیں ورنہ تمہاری اتنی گھٹیا حرکتوں پر وہ صدمے سے مر جاتیں۔“

انتہائی غصے کے عالم میں کھڑا دو چار منٹ اسے دیکھتا رہا پھر پیر پختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ وہ لاؤنج میں صوفے پر پڑا اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ گھڑی پر نظر پڑی تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ خود کو پرسکون اور نارمل کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی سے نہایا۔ نہانے سے طبیعت خاصی بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ اعصاب پرسکون ہو گئے تھے۔



خود بھی دوپہر سے بھوکا تھا اور وہ بھی اس لیے کھانے کا بندوبست کرنے کا خیال آیا۔ گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر جاتے ایک نظر اس کمرے کے بند دروازے پر ڈالی جہاں اسے لا کر ڈالا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے وہ خود کو دوپہر کے مقابلے میں خاصا بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اس کا پسندیدہ پزا اور بہت ساری آئس کریم لے کر واپس آیا اور جلدی جلدی ٹرے میں پزا پلٹیں گلاس اور پیسی کی لیٹربول رکھ کر اس کے کمرے میں آگیا۔ جس زاویہ سے پڑا اسے چھوڑ کر گیا تھا وہ ابھی تک اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس کے آنے پر بھی وہ اسی طرح پڑی رہی تھی۔

ٹرے سائڈ میں رکھ کر وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا اور بولا۔

”مجھے اپنی کسی حرکت پر کوئی افسوس نہیں اس لیے تم یہ امید مت رکھنا کہ میں تم سے معذرت کروں گا۔“

اس کی بات کے جواب میں بھی دوسری طرف کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

”تھو کھانا کھا لو۔“ اس نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچ کر اٹھا دیا۔ اس طرح کہ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے تھے۔ اس کے چہرے

حارث آگے بڑھ کر اسی طرف آگیا۔

”ہٹو تم سامنے سے یہ ہمارا پرسنل معاملہ ہے۔“ اس نے حارث کو پرے دھکیلا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اپنی گاڑی تک لے آیا۔ وہ جواب تک شک کی کیفیت میں تھی ایک دم ہلکا اٹھی۔

”چھوڑو مجھے۔“ وہ اس کی مضبوط گرفت سے خود کو چھڑانے لگی۔

پارکنگ ایریا میں اس وقت لنچ ٹائم کی وجہ سے رش تھا۔ سو اچھا خاصا تماشا لگ گیا تھا۔ تمام لوگ اس پروجیکشن کو دیکھ کر یہی سمجھ رہے تھے کہ کوئی لڑکی دن دباڑے اغوا ہو رہی ہے اور بد قسمتی سے ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے اتنا دیوالیہ ہو گیا ہے کہ روڈ پر کوئی خون میں نہایا جان دے دے یا کوئی لڑکی دن دباڑے بھرے بازار میں اغوا کر لی جائے کسی میں اتنی اخلاقی جرات نہیں کہ اسے بچائے سو اس وقت بھی سب تماشا بنے اس صورت حال کو دیکھ رہے تھے۔

اسے گاڑی میں دھکیل کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ یہ سب کچھ صرف دو یا تین سیکنڈز کے اندر اندر ہوا تھا۔ گاڑی کی رفتار انتہائی حدوں کو چھو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب ایکسیڈنٹ ہوا کہ تب اسے اتنے شدید غصے میں اس نے اب تک کی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لاکھ اس کے مقابل ڈٹ کر کھڑی ہونے لگی تھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگی تھی مگر اس وقت اس کے غصے سے وہ بری طرح ڈر رہی تھی۔

گاڑی پارک کر کے اسے اسی طرح گھسیٹتا ہوا سیڑھیوں سے ہی اوپر لے آیا۔ لفٹ سے نکلتے اور کوریڈور میں کھڑے دو چار افراد نے اس منظر کو تعجب سے دیکھا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس کا بازو دبوچے دوسرے سے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور اسی طرح لا کر اسے ایک کمرے میں بستر پر پٹخ دیا۔ وہ اونڈھے منہ بیڈ پر گری پڑی تھی۔

”دل تو میرا تمہیں قتل کرنے کا چاہ رہا ہے مگر میں ایسا نہیں کر رہا ہوں تو صرف اپنی اماں کی وجہ سے۔“ وہ



پر پھیلی آنسوؤں کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی  
 ہے اس کے روئے چہرے پر گہری نظر ڈالتا ہوا  
 بولا۔

”جاؤ جا کر منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔“ اس کے دھیمے لب و لہجے سے ظاہر بھی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ پھر ان کے درمیان کیا ہوا تھا۔

اس کی بات کے جواب میں بھی وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھ ہی رہی تھی۔

”اچھا منہ نہیں دھو رہیں تو ایسے ہی کھا لو۔“ اس کے لیے پلیٹ میں برار رکھتے ہوئے بولا۔  
پھر پلیٹ اس کے آگے کی تو وہ ہاتھ بڑھائے بغیر ویسے ہی بیٹھی رہی۔

”اب کیا میں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں۔“ وہ کچھ بے بسی سے بولا۔ ”دیکھو، خالی پیٹ تو تم سے کچھ بولا بھی نہیں جائے گا جبکہ ابھی تمہیں مجھ سے بہت سارا الزنا بھی ہے۔“

اس کی اس بات پر پہلی مرتبہ سراٹھا کر اسے دیکھا  
گیا تھا۔ پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے کر سائڈ میں رکھ  
دی اور بولی ”مجھے کچھ نہیں کھانا۔“

”شرافت سے پیٹ اٹھا کر کھانا شروع کرو۔ ورنہ تمہیں معلوم ہے مجھے کتنی ٹیڑھی انگلیوں سے ٹکانا بھی آتا ہے اور تمہارے بارے میں میرا تازہ ترین خیال یہ ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ تم سے کچھ بھی کہنا سنا عبث ہے۔ تم صرف ڈنڈے کی زبان سمجھتی ہو اور اب میں وہی زبان استعمال کروں گا۔“

اس کے دھمکانے پر وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔  
 ”مجھے واپس جانا ہے۔“  
 ”کہاں واپس جانا ہے؟“ وہ اپنے لیے پڑا نکالتے ہوئے بولا۔

”میں اکیلی بھی جاسکتی ہوں۔“ وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

”بہت شوق ہے تمہیں ملکہ عالیہ بننے کا۔ لوگ ہر

وقت تمہاری پوجا کرتے رہیں۔ تم غمور کے سر ہاتے  
اپنی پرستش ہوئی دیکھتی رہو۔ اپنی غلطی پر شرمندہ  
ہونے کے بجائے اکثر رہتی ہو۔ یہ میں ہی ہوں جو  
تمہاری اتنی من مانیوں اور بے ہود گیلیاں ہواشت کر رہا  
ہوں کوئی اور ہوتا تو تمہارا دماغ دو سینڈ میں درست کر  
دیتا۔“ وہ دوبارہ غصے میں آ گیا تھا۔

”کب کہا ہے میں نے کہ مجھے پروا نہ تھی۔“  
آپ بہت اچھے ہیں اور میں بہت خراب ہوں۔ اتنے  
اچھے لوگوں کو تو ویسے بھی بڑے لوگوں سے کوئی واسطہ  
نہیں رکھنا چاہیے۔“ بھڑائی ہوئی آواز میں بمشکل اپنی  
بات مکمل کر کے وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”آپ یہ پھر سے خود ترسی کا دودھ پڑا ہے۔ خود پر ترس کھا کھا کر تم نے اپنے آپ کو کسی قابل نہیں چھوڑا۔ سناؤ پھر وہی دکھ بھری داستان کہ میں اکیلی ہوں۔ میرا کوئی نہیں وغیرہ۔ تم اپنے آپ پر جب اس طرح رحم کھاتی ہو تو مجھے تمہاری اس سوچ پر رحم آتا ہے۔“ وہ اس کی برسنے کے لیے بے تاب آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی بولا۔

”رونے کا دل چاہ رہا ہے تو روتو۔ ویسے رونا تمام مسائل کا حل نہیں ہوتا۔“

اس کے کہنے کی دیر تھی۔ آنسو بڑی شدت سے بہنے شروع ہو گئے تھے۔ حسن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس بیڈ پر بٹھایا اور بولا۔

”دور آسو جو تم کیا کرنے جا رہی تھیں؟ کیا اماں نے تمہیں اسی بات کی تربیت دی تھی؟ میرا فرض بننا تھا کہ تمہیں کسی غلط راستے پر چلنے سے روکوں۔“

”میں کچھ غلط نہیں کر رہی تھی۔ دنیا کی لکھی ہوئی لڑکیاں جاپ کرتی ہیں۔ میں نے کیا غلط کیا؟“ وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

”غلط آدمی کے پاس گنیں نال۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی۔ تم اپنی بے وقوف اور سیدھی ہو، تمہیں اپنے نفع نقصان کا کچھ پتا نہیں۔ وہ اول درجے کا فلرٹ اور کرپٹ آدمی ہے۔ جب صحیح جگہ چاہ کر رہی تھیں۔ میں کچھ نہیں بولا تھا۔“ وہ نرم مزاج میں

یہاں پر باتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

”تمہاری سادگی اور مخصوصیت ہی تمہارا حسن ہے۔  
- تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ماورِ پدر آزاد  
جدیدت کی حامی لڑکیوں کے طور طریقے اپناؤ۔ تم  
جیسی ہو ویسے ہی بہت اچھی ہو۔“

وہ ایک دم یوں پیچھے ہٹی تھی جیسے کرنٹ لگا ہو۔  
اس کا ہاتھ جھٹک کر خود ہی اپنے ہاتھوں سے رگڑ کر  
انصاف کیے اور بڑے طنز پر انداز میں بولی۔

انسانی جدیدیت کی حامی لڑکیوں کے ساتھ جب  
کی سڑکیں ٹاپا جاتی ہیں تو وہ بہت اچھی ہو جاتی  
ہیں۔ کسی سے نہ ملوں بات نہ کروں کہ اس سے  
ت اور غیرت کے مسئلے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خود  
بھر لڑکیوں کو ساتھ لے کر گھومتے رہیں تو وہ جائز  
اگر کسی وہ لبلل سوچ ہے جس کا وہ جند و اپنا جا رہا  
تف ہے اس آزاد خیالی پر؟

کسی بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔ جبکہ وہ بھی غصے میں بھری بیٹھی تھی۔

اور میں اپنی سادہ اور معصوم بھی نہیں ہوں جتنا  
 گرجے جتنے تھے ہیں۔ میں بڑی سی چادر کی بگل مار  
 ہر نکلوں۔ مجھے کوئی نہ دیکھے اور خود تمام دن  
 کے بھر مٹ میں گزاریں۔ کتنا دہرا معیار  
 "وہ وقتہ لگا کر نہیں رہا تھا۔"

میری کو لیکز ہیں ان سے میں یہ نہیں  
چاہوں اور دھویا یہ کہ وہ کہو۔ انہیں ان کے گھر  
کیس گے۔ میرا کام اپنے گھر کی حفاظت کرنا

س کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر بولا۔ ”مجھے بتا  
صرف اسی بات کا ہے باقی باتیں تو

تق بھی کہہ رہی تھی کہ تمہاری کزن پڑی بد

فاغ اور سڑیل سی ہے تم ایسی لڑکی کو برداشت کیسے کرتے ہو۔

”اس سے کہیں“ میرے غم میں دیکھنا ہوتا چھوڑ دے۔ اس نے خود تو اخلاقیات میں ڈاکٹریٹ کر رکھی ہے وہی کافی ہے۔ میں جیسی بھی ہوں ٹھیک ہوں۔“ اس ایک لڑکی سے تو وہ شدید نفرت کرتی تھی سو اس کے زکریاؑ آگ بولہ ہونا لازمی تھا۔

وہ زبردستی سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ کوئی جواب دینے کے بجائے چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ اس موضوع پر کچھ بھی بول کر خود کو ظاہر کرنا اسے ہرگز منظور نہ تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے چہرے کے آثارِ حیا و ملاحظہ کر رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ مابین شروع کرتا ہوا بولا۔

”مجھ سے آپ مزید بھوکا نہیں رہا جاسکتا لہذا میں تو رہا ہوں۔ تم شوق سے ایسے ہی بیٹھتی رہو۔ ویسے اہل کی طرح کے جو غلطی کرنے مجھے نہیں آتے کہ گڑبڑا میری رانی کھانا کھا کر میری زندگی پر احسان نہ دے۔ وہ آرام سے پاؤں پھیلائے کھانا کھائے لگا۔ اور حقیقت یہ بھی یہی ہے کہ اہل کے بے جا لاڈ نے تمہارا دل اتنی بڑی طرح خراب کر دیا ہے کہ تمہارے سہ ہونے کے کم از کم مجھے تو کوئی شمار نہ آئے۔“

کی بات پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور

مجھے بتا ہے، آپ کو ہمیشہ اسی بات پر مجھ سے خوار  
رہا کہ میں آپ کی اور اماں کی محبت کے  
حاصل ہوئی، آپ نے مجھے شروع دن سے  
میں قبیل میں کیا تھا، شاید آپ کو لگا تھا کہ  
کی محبت شیر کرنے آئی ہوں۔

میں نے گویا خود کو تمام سوال جواب کے لیے تیار



”مجھے ثابت کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں یہ بات جانتی ہوں۔ آپ نے ہمیشہ مجھ سے نفرت کی ہے۔“ وہ ناراض لہجے میں بولی۔

”میں نے تم سے ہمیشہ محبت کی ہے۔ اور تم اس محبت کو کسی اور معنوں میں لینے کی کوشش مت کرنا۔ یہ محبت بالکل ایسی ہی تھی۔ جیسی ایک گھر میں رہنے والے افراد آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ تم جس روز ہمارے گھر آئی تھیں۔ میں نے اور اماں نے تمہیں اسی روز اپنے گھر کا ایک فرد مان لیا تھا۔ ہم نے تمہیں کبھی پر لیا نہیں سمجھا۔ البتہ کھوت تو تمہاری نیت میں تھا۔ تم نے اس گھر کو اور ہمیں کبھی سچے دل سے اپنا نہیں سمجھا۔ خود کو ہمیشہ غیر سمجھتی رہیں۔“ وہ بہت رसान سے بولا۔

”آپ اماں کو سچ میں مت لائیں۔ مجھے ان کی محبت اور خلوص پر کوئی شک نہیں مجھے ان کی محبت پر فخر ہے۔“

”اور میری محبت اور خلوص پر شک ہے۔؟“ وہ ناراض ہوا۔

”شک نہیں مجھے یقین ہے کہ آپ کو میں کبھی اچھی لگی ہی نہیں۔ ایک بوجھ اور زبردستی کی ذمہ داری سمجھا ہے آپ نے مجھے ہمیشہ میرا دل دکھایا۔“ میری انسلٹ کی۔

وہ بھرتی ہوئی آواز میں بولی تو وہ بے اختیار ٹوکنے والے انداز میں بولا۔

”اگر وہ کیوں کی طرح جرح کرنے لگتی ہوئی ہو تو رونے دھونے کے بجائے اپنے اور گلنے والے الزامات کا بھی دفاع کرو۔ اگر میں کہوں کہ تم نے ہمیشہ میرا دل دکھایا ہے مجھ سے نفرت کی ہے اور مجھے آنکھوں کیے تو تم کیا کہو گی۔“

”میں نے بھی ایسا نہیں کیا۔“ وہ روئی ہوئی بولی۔

”کیا ہے تم نے ایسا بے شمار مرتبہ تم نے میرا دل دکھایا ہے۔ اور اس پر طویہ کہ مظلوم بھی خودی بن کر بیٹھ گئی ہو۔“ وہ اپنی بات میں زور پیدا کرتے ہوئے بولا۔

”میں خالی خولی دعوے نہیں کرتی۔ اپنی بات کو ثابت بھی کر سکتا ہوں۔ تمہارا خیال ہے تم اکیلی ہو۔ تمہارا کوئی نہیں۔ نہ ماں باپ نہ بہن بھائی نہ کوئی اور رشتے دار تمہیں کوئی پوچھنے والا تم سے محبت کرنے والا کوئی نہیں تو یہ سب کچھ تو میرے ساتھ بھی ہے۔ تمہاری طرح ماں باپ بہن بھائی اور رشتے دار میرا بھی کوئی نہیں ہے۔ پھر تو اصولاً مجھے بھی تمہاری طرح مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنا چاہیے۔ کیا میرا گناہ یہ ہے کہ میں مر رہوں میں تمہاری طرح رو نہیں سکتا لیکن ایک انسان تو ہوں کیا مجھے اس بات کا غم نہیں ہے۔ میرا ایک محبت بھرا گھر تھا جہاں ہم اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے چھین گیا۔ اگر خود ترسی تمام مسائل کا حل ہوتی تو میں بھی تمہاری طرح خود ترس ہو جاتا۔“

اسے لب کھولتے دیکھ کر ٹوکنے ہوئے بولا ”ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔“ پھر وہ چار سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ گویا ہوا۔ ”مجھے یہ بات کہہ لینے دو کہ تم خود ترسی کے مرض میں بری طرح مبتلا ہو۔ اور اس بیماری کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ اماں کے انتقال کے بعد تم تو صرف اس غم میں ہلکان ہو رہی تھیں کہ اماں نہیں رہیں۔ لیکن میرے اوپر دہری ذمہ داری تھی۔ مجھے اپنا دکھ بھول کر تمہارے لیے خود کو کمپوز کرنا تھا۔“ اماں اگر جانے سے پہلے مجھ سے کوئی وعدہ نہ بھی لیتیں تب بھی میں تمہارا خیال رکھتا۔ تمہاری حفاظت اپنی جان سے بھی پیہہ کر کرتا۔ اماں کے بعد میں ایک دم بوم بھلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ ظاہر ہے اماں کے بغیر ہم دونوں ایک ساتھ وہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ اماں کے انتقال کے بعد میں مسلسل اسی سوچ میں لگا ہوا تھا کہ کیا کروں۔ سب سے پہلا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ تمہاری شادی کروں۔ میرے دو چار اچھے جاننے والے تھے جہاں میں تمہاری شادی کر سکتا تھا۔ اور شاید میں ایسا کر بھی دیتا لیکن پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ ایسا کر کے میں تمہارے ساتھ بہت بڑی زیادتی کروں گا۔ تم تو شاید

”میں بائبل جاننے والی طرح میری بات مان بھی جانتیں لیکن مجھے تم پر بے تحاشا ترس کیا۔ میں اس وقت بھی یہ بات کہتا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ اماں کا محبت کرنے کا انداز درست نہ تھا۔ ٹھیک ہے وہ تم سے بے حد پیار کرتی تھیں لیکن محبت یہ نہیں کہتی کہ ہم جس سے پیار کرتے ہیں اسے اپنے سہارے کے بغیر چلنے ہی نہ دیں۔ اماں کی محبت نے تم سے خود اعتمادی چھین لی تھی۔ تم ایک ذری سہمی سی چیز کی طرح تھیں۔ زندگی کے بارے میں تمہارے کوئی نظریات نہیں تھے۔ تمہارے خیال سے زندگی اسی گھر تک محدود تھی۔ تم اپنے کپڑوں، جوتوں سے لے کر پڑھائی کے لیے مضامین اختیار کرنے تک ہر معاملہ میں اماں کی محتاج تھیں۔“

جب یہ خیال میرے ذہن میں آیا تو میں نے سوچا کہ ابھی تمہاری شادی نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملنا چاہیے۔ تم ایک جیتی جاتی باشعور لڑکی تھیں۔ کیوں آخر تمہارے بارے میں ہر فیصلہ میں یا اماں ہی کرتے۔ تمہیں حق تھا کہ تم اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرو۔ زندگی کو سمجھو اسے قریب سے دیکھو۔ یہ سوچ کر میں نے تمہیں ہاسل بھیجے کا سوچا تاکہ تمہا سڑ کر لو۔

یونیورسٹی جانے والوں سے ملو اور زندگی کے بارے میں خود سوچو۔ مجھے نہیں پتا کہ ایسا کر کے میں نے کون سا گناہ کیا تھا جو تم مجھ سے ناراض ہو گئیں۔ اور یہ الزام لگایا کہ میں نے تمہیں گھر سے نکالا ہے۔ میں نے تمہیں اکیلا تو نہیں چھوڑا تھا۔ میں ہر لمحہ تمہارے ساتھ ساتھ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ تم زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ سکو۔ تاکہ اگر کسی وقت میں نہ رہوں تو بھی تم ہمت نہ مارو۔ تم خود پر بھروسہ کرنا سیکھ جاؤ۔ لیکن تم نے اسے گھر سے نکالنا اور اپنی انسلٹ سمجھ لیا۔ مجھ سے ناراض ہو گئیں۔ یہاں تک کہ مجھ سے پیسے لینے سے بھی انکار کر دیا۔“

وہ ایک لمحہ کو سانس لینے کو رکھا تو وہ بول پڑی۔

”میں بائبل جاننے والے ریٹارڈ نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے میری انسلٹ کی تھی۔ مجھے اتنا دکھ ہوا تھا میں پتا نہیں سکتی۔“

”میں نے کبھی تمہاری انسلٹ نہیں کی۔“ وہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔

”کی تھی آپ نے اس روز جب میں گھر آئی تھی جب آپ نے گھر کھینچ دیا تھا۔ میں نے رات کو خواب میں اماں کو دیکھا تھا مجھے گھر اتنا یاد آیا کہ میں فوراً چلی آئی اور آپ نے میرے آنے کا یہ مطلب نکالا کہ میں پیسے لینے آئی ہوں۔ آپ نے خود اس بات کا احساس دلایا تھا کہ میں غیر ہوں۔ ایک بوجھ ہوں۔“

وہ دوبارہ رونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ ایک لمحے کو چپ سا ہو کر کچھ یاد کرنے لگا پھر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

”تمہارے بارے میں میری یہ رائے کہ تم ایک جلد باز اور بے وقوف لڑکی ہو ہنڈرڈ برسٹ درست ہے۔ اول تو اگر میں یہ سمجھا تھا کہ تم میرے لیے آئی ہو تو بھی اس میں دکھ درد میں مبتلا ہونے کی کوئی بات نہیں تھی۔ تمہارا حق تھا جو پھر تم دھونس سے زبردستی مانگ کر ہر طرح مجھ سے پیسے وصول کر سکتی تھیں۔ میں نے تمہیں بھی اپنے آپ سے الگ نہیں سمجھا تھا۔“

”جی نہیں میرا کوئی حق نہیں تھا آپ کے پیسوں پر۔ اور میں پیسے لینے آئی بھی نہیں تھی۔“ وہ ناراض لہجے میں بولی۔

”تم اپنی خود ساختہ بد گمانیوں سے کبھی نکھو تو تمہیں پتا چلے کہ میں تمہارا کتنا خیال رکھتا تھا۔ اماں کا غم بھول کر میں صرف تمہاری وجہ سے فوراً زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ جس واقعہ کا تم ذکر کر رہی ہو۔ تمہیں پتا ہے میں ان دنوں کتنا پریشان تھا۔ اور میرے پاس تو کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس سے میں اپنی پریشانی شیر کر سکتا۔ تمہارے لیے تو میں تھا۔ میرے لیے کون تھا؟ تم نے تو کبھی ایک بار بھی بھولے سے نہیں سوچا ہو گا کہ تمہاری طرح میں بھی تھا ہوں میرا بھی کوئی نہیں ہے۔ تمہیں اپنی ناراضیوں سے فرصت



کرتا رہا تھا۔ سو صبح آنکھ نہ کھلی۔ بارہ بجے تمہارے آنے پر میری آنکھ کھلی تو تم سے زیادہ اس وقت مجھے وہاں پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ بے چارہ یقیناً وہاں میرا انتظار کر رہا تھا۔ تم کوئی مہمان تو نہیں تھیں کہ میں کہیں جانے کی جلدی میں ہوں مگر آداب میزبانی سے مجبور ہو کر آئے بیٹھے۔ اپنا ہی گھر سمجھئے اور تکلف مت کیجئے۔ قسم کے الفاظ بولتا۔ تم میرے گھر کی ایک فرد تھیں اور اپنے گھر کے افراد کے ساتھ ہمیں جھولی اخلاقیات نبھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس قصے میں انسلٹ کہاں ہے۔ بلکہ ناراض تو مجھے ہونا چاہیے کہ تم نے میری پریشانی شیر نہ کی۔ کبھی اپنائیت کا احساس نہیں دلایا۔ وہ خفگی بھرے انداز میں بولا۔

”آپ خود سے بتا سکتے تھے لیکن آپ کے نزدیک میں اس قابل ہی نہیں تھی کہ مجھے کچھ بتایا جاتا۔ مجھ سے تو ہمیشہ دشمنوں کی طرح باتیں چھپائی گئی ہیں۔ میں تو جیسے جلنے والوں میں سے تھی۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی تو وہ خفگی بھلا کر بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”تمہیں تو کسی ملک کی ملکہ ہونا چاہیے تھا۔ تمہارے سارے انداز بادشاہوں والے ہیں۔ یعنی حیت بھی میری اور پٹ بھی میری۔ تمہاری بدگمانیوں کی کوئی انتہا بھی ہے۔ اگر تمہاری دوستوں سے اچھی طرح بات کروں محض تمہاری وجہ سے تو الزام لگتا ہے کہ خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر کرٹسی شو کر رہا ہوں اور اگر ایسا نہ کرتا بد اخلاقی سے پیش آتا تو کہا جاتا، میری دوستوں کو انور کر کے میری انسلٹ کی گئی ہے۔ گویا ثابت یہ ہوا کہ برائی ہر صورت مجھے ہی ملنی ہے چاہے میں کچھ بھی کر لوں۔“

وہ اس کے سر پر چپٹ لگاتا ہوا بولا۔ ایک لمحہ کو اپنی اس روز کی کئی باتوں پر کچھ شرمندگی بھی ہوئی کہ اس میں ”اس“ کا بھی کافی ذکر ہوا تھا اور وہ ”اس“ کے ذکر کے حوالے سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی شرمندگی سے جھکی آنکھوں کو دیکھ کر مسکرایا۔

ملتی تو کسی اور طرف توجہ دیتیں۔ میں اصولوں پر سمجھوتا نہیں کر سکتا تھا۔ غلط کام نہ کر سکتا تھا نہ کرتے دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی خوشامد اور جی حضوری کر سکتا تھا اور ایسی خصوصیات کے حامل شخص کے ساتھ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ سب میرے ساتھ بھی ہوا، میری جاب میں میرے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ میں ریزائن کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میرے دوستوں نے سمجھایا کہ میں اپنی نام نہاد اصول پرستی اور حق گوئی کو ایک طرف رکھ دوں اور وہی کرنے لگوں جو سب کر رہے ہیں، کیونکہ سیدھا راستہ بہت دشوار ہے۔ اور اس پر تنہا چلنے میں لوہمان ہو جاؤں گا۔ تب بھی میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اماں بھی مجھے سمجھایا کرتی تھیں کہ میری غیر ضروری انا اور ضد مجھے نقصان پہنچائے گی۔ لیکن میں کسی سمجھوتے کے لیے آمادہ نہ تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب اماں کے انتقال کو بمشکل دو ڈھائی مہینے ہوئے تھے۔ جاب تو چھوڑ دی تھی، اب سوال یہ تھا کہ کیا کروں۔ مجھے خود کو اسٹیبلس کرنا تھا۔ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے بھی۔ آخر ایک فلائش اور بے کار آدمی کی کزن سے کون شادی کرنے پر آمادہ ہوتا۔ تم مانویا نہ مانو، میں تمہارا حوالہ ہوں۔ تمہاری زندگی کی خوشیوں کا دار و مدار میرے اوپر تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے ایک کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ شروع کرنے کا سوچا۔ ظاہر ہے اس کے لیے سرمایہ درکار تھا۔ گھر تو اس میں رہنے والے لوگوں سے گھر بنتا ہے۔ خالی مکان کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہ تھی سو اسے بارہ لاکھ میں فروخت کر دیا۔ بابا کے اکاؤنٹ میں پانچ چھ لاکھ تھے۔ وہ اور کچھ دوستوں سے ادھار لے کر میں نے اللہ کا نام لے کر کرائے پر جگہ لے کر اپنے انسٹیٹیوٹ کا آغاز کیا۔

جس دن کا تم کہہ رہی ہو، اس روز مجھے صبح گیارہ بجے وہاں کے مالک سے ڈبل فائنل کرنے جانا تھا۔ رات بھر جاگ کر اپنے انسٹیٹیوٹ سے متعلق کام



”میں ایک بہت ہی برا انسان ہوں۔ خواہ مخواہ کی تعریفوں نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اور ساتویں آسمان پر چڑھا رہتا ہوں۔ یہ سب کچھ تو تمہارے فرشتوں نے کہا تھا اب ذرا یہ بتاؤ کہ میں نے تمہارا دل دکھایا تھا یا تم نے میرا؟ اتنی محبت سے یہ گھر ڈیکوریٹ کیا۔ ہر چیز تمہاری پسند کے مطابق لایا اور جب محترمہ کو لینے گیا تو کتنی بری طرح میرا دل توڑ دیا کہ میرے گھر میں مگر کتنی قدم نہیں رکھیں گی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنی زیادہ بد تمیز اور ضدی ہو تو اسی روز گھسیٹ کر ساتھ لے آتا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔“

”مجھ سے تو خیر تم ہمیشہ ہی بد گمان رہی ہو لیکن یہ تازہ ترین ناراضی جو کہ بڑی شدید نوعیت کی تھی۔ اس کے اسباب سمجھنے سے میں ابھی تک قاصر ہوں۔“

”میں کوئی ناراض و راض نہیں ہوں۔“ وہ صاف مگر گئی۔

”یہ بات بھی آج سمجھ میں آئی ہے کہ اچانک مجھ سے پیسے لینے سے کیوں انکار کر دیا تھا۔ میں تو یہی سمجھتا رہا کہ اپنے گھر بدر کیے جانے پر غصہ دکھایا جا رہا ہے۔“

وہ کچھ سوچ کر ہنسنے لگا۔ پھر اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس روز تم مجھے اتنی مختلف اور غیر معمولی لگی تھیں کہ میں حیران رہ گیا تھا، ایک ایسی لڑکی جسے آپ شروع سے جانتے ہوں، اس کی عادات مزاج سب سے آگاہ ہوں وہ اچانک کوئی غیر معمولی کام جو اس کی شخصیت سے بیچ نہ کرتا ہو کرے تو ہر شخص ہی حیران ہو گا۔ تم جو میرے خیال سے ایک ڈری سہمی بزدل اور بے وقوف سی لڑکی تھیں۔ اس روز میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی شدت سے مجھے رد کرتی تمام دنیا کی لڑکیوں سے مختلف لگیں۔ میرا یہ خیال کہ تم نے اماں کی صحبت میں رہ کر ڈرنا اور لاڈ کروانا ہی سیکھا ہے۔ اس روز بالکل غلط ثابت ہو گیا۔ تم تو بالکل میرے جیسی تھیں۔ ضدی، اکھڑ اور خود سر، اپنی ناک اور انا کے پیچھے کسی نفع نقصان کی پروا نہ کرنے والی۔“

میں جو خود ضدی اور بد مزاج سمجھتا تھا اپنی ہی عادات زندگی میں پہلی مرتبہ کسی میں دیکھیں اور کسی بھی کون جسے میں ایک عرصہ سے جانتا تھا تو کتنی دیر تک اسے دیکھتا ہی رہا۔ حالانکہ تم مجھے رد کر رہی تھیں مجھے اکڑ دکھا رہی تھیں۔ لیکن مجھے پھر بھی اس لمحے تم بہت اچھی لگی تھیں۔ میں اپنی بدلتی کیفیت پر حیران تھا وہاں سے گھر واپس آ کر جب میں نے اپنا تجزیہ کیا تو بڑا غیر متوقع جواب سامنے آیا۔ ایک ایسی لڑکی جس کے بارے میں میرا کہنا تھا کہ وہ صرف اور صرف میری کزن ہے اور پھر میں محبت و حبت کو وقت کا زیاں اور بے کار لوگوں کے کرنے کا کام سمجھتا تھا، اچانک تمہارے لیے بڑے مختلف انداز میں سوچنے لگا۔ اپنی اس سوچ کی تبدیلی کے باوجود میں خاموش رہا۔ ایک تو اس لیے کہ تمہاری انا اور ضد مجھے بڑی پیاری لگ رہی تھی دوسرے اس لیے بھی کہ یہ بات تو میں نے خود چاہی تھی کہ تم خود اعتماد اور بولڈ ہو جاؤ۔ پھر جب تم ایسا کرنے لگی تھیں تو میں تمہیں کیوں روکتا۔ تم جو کچھ کرتی رہیں میں نے کرنے دیا، ہاں البتہ میں ہر جگہ تمہارے ساتھ تھا۔ کسی جگہ تمہیں کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا تو میں اس جگہ تم سے پہلے موجود تھا۔ جسے تم جاسوسی کرنا کہتی تھیں وہ میری محبت تھی۔ مجھے تمہاری پروا تھی میں تمہیں کبھی بھی کوئی دکھ پہنچنے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ میری اس خواہش کے نتیجے میں تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو سکتی ہو۔ دنیا میں میں اکیلا مرد نہیں۔ تمہیں مجھ سے کہیں بہتر مجھ سے زیادہ محبت کرنے والا کوئی بھی شخص مل سکتا تھا۔ اور پھر تم اب میری گھر میں بند رہنے والی وہ کزن نہ تھیں جس کی زندگی میں واحد مرد میں ہی تھا اور اسی لیے وہ اسے پسند کیا کرتی تھی۔ اپنے آپ کو ایسی صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا اگر کوئی ایسا شخص جو ہر لحاظ سے تمہارے قابل ہوتا، تمہارا انتخاب ہوتا تو میں اپنی کسی خواہش کا اظہار کیے بغیر خود تمہاری اس سے شادی کر دیتا۔“

وہ کتنی مختلف زبان بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی

بے یقینی دیکھ کر مسکرا دیا اور بولا۔

”تمت یقین کرو میری باتوں کا، تمہیں تو ویسے بھی مجھے تکلیف پہنچا کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بقول تمہارے اماں سے کیا وعدہ نبھانے کے لیے۔ جب ہر اتوار تمہارے پاس آتا تو میرے ساتھ کتنا برا سلوک کرتی تھیں۔ گھڑی پر نظریں جمائے بے زاری کا اظہار کرتیں۔ اور اگر بات گلے شکوے کی ہے تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ تم نے تو کبھی اماں کی وجہ سے بھی میرا خیال نہ کیا۔ آخر میں تمہاری پیاری اماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چلو اسی حوالے سے کبھی تم نے مجھ سے میری خیریت پوچھی۔ کبھی ایک مرتبہ بھی مجھے فون کیا۔ میرا حال دریافت کیا؟ کبھی نہیں۔ کیا سارے فرائض میرے اور حقوق تمہارے تھے۔ اگر تم مشکلات میں تھیں تو آسان زندگی تو میں بھی نہیں گزار رہا تھا، یہ سب مجھے کسی طشتری میں سجا کر پیش نہیں کیا گیا۔ سیدھا راستہ بڑا خطر اور خار زار ہوتا ہے۔ میں اس راستے پر تنہا چلا، تاکہ تمہارے اور اپنے لیے ایک بہتر زندگی حاصل کر سکوں۔“ اپنی بات ختم کر کے وہ اسے دیکھنے لگا جو خاموش بیٹھی ایک ٹک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”میں نے ہر بات تمہیں سچ سچ بتادی۔ اب تم بھی جلدی سے بتاؤ کہ اتنی شدید ناراضی کس بات پر تھی۔ مجھے پتا ہے کہ یہ نوکری کسی انتہائی غصے کے عالم میں کی گئی تھی۔“

”میری آپ سے کوئی ناراضی نہیں۔“ وہ اپنی کوئی بھی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”شفق سے تو تم پہلے بھی مل چکی تھیں اور تمہارے چہرے کے غضب ناک تاثرات کو میں نے بڑا انجوائے بھی کیا تھا۔ اتنے دن گزرنے کے بعد اس بات پر اب تو ناراضی ہو نہیں سکتی۔“

وہ کچھ سوچتا ہوا بول رہا تھا جیسے بات کا سرا پکڑنا چاہتا ہو۔ اور اس روز اکڑ کتنا رہی تھیں۔ میں نے کتنا بلایا تھا کہ اندر چلو لیکن گردن اکڑائے بیٹھی رہیں۔ اسے ایک اور بات یاد آئی تو شکوہ کر بیٹھا۔



”میں کیوں اندر جاتی ہوں بلائے مہمان کی طرح۔ پھر وہ آپ کی لاڈلی ساتھ تو تھیں۔ میری کیا ضرورت تھی۔“

اس بات پر وہ خود کو روک نہیں پائی اور بے اختیار بول بیٹھی۔ وہ اس کی بات سے لطف اندوز ہوتا مگر تکتی دیر تک ہنستا رہا۔

”وہ اپنے بارے میں تمہارے اتنے شاندار کنسنس بن لے تو صدمے سے بے ہوش ہو جائے۔ ویسے تمہاری یہ جیسی مجھے اتنی اچھی لگ رہی ہے کہ کوئی صفائی دینے کا دل نہیں چاہ رہا لیکن پھر بھی تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے ساتھ ایم اے میں تھی۔ اچھی ذہن لڑکی ہے اور آج کل میرے ہی دفتر میں کام کر رہی ہے۔ ہمیں تو معلوم ہی ہے کہ میرے ایف بی سی والے آفس کا۔ آخر جاسوسی کرتی تم وہاں پہنچی تھیں۔“

وہ شرر نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ تو وہ ایک لمحہ کو جھپک کر رہ گئی۔ پھر اپنی اس کیفیت سے چھٹکارا پاتی طنز پر انداز میں بولی۔

”اور اس سے متعلق بھی اس کی ذہانت ہی کی وجہ سے کی گئی تھی۔“

”متعلق۔“ وہ اس نے الزام پر سکتے کی کیفیت میں تھا۔ ”تم نے کس نے کہا؟“

”کسی نے بھی کہا بات تو سچ ہے۔“ وہ اپنی بات پر زور دیتی بولی۔

”اچھا تو اس بات پر اتنا شدید غصہ تھا۔ وہ صرف میری ایک کو لیک ہے۔ لوگوں کو خواہ وہ سہول کو اس کیڈ لائز کرنے کی عادت ہوئی ہے۔“

”صرف وہی ایک کو لیک تھی۔ اور اتنی فارغ بھی کہ ہر وقت دم چٹانی ساتھ رہے۔“

”شکر ہے اب شکوں میں کچھ اپنائیت تو محسوس ہوئی۔ جنہیں اگر وہ اتنی پری لگتی ہے تو میں اس سے کہہ دوں گا کہ کہیں اور نوکری کر لے اور مجھ سے نہ ملے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم یہ بات اپنے منہ سے کہو۔“ وہ ہنسنے پر زور دیتی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے

بولی، لیکن آنکھیں کسی شرارت سے روشن تھیں۔

”میں کیوں کہوں، میری بلا سے جس سے چاہے ملیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر لا پرواہی سے بولی۔

”بالکل ٹھیک کہتی ہیں تمہاری دوستیں، تم کھڑی دیکھتی رہنا اور تمہارا ٹائی ٹنک ڈوب جائے گا۔ وہ تو کہو کہ جہاز کا پاکستان ہی کچھ ہوش مند ثابت ہوا، ورنہ تم نے تو ڈوبنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔“ وہ ہنس پڑا۔

”بڑی تیز چیز ہو۔ میں فضول ہی تمہیں معصوم اور بھولی بھالی سمجھتا رہا۔ میرے ساتھ بن رہی ہو۔“ وہ اس کا سر پکڑ کر اپنی طرف کرتا ہوا بولا۔ ”تم سے تو کہیں بہتر متفق ہے۔ جو میرے ساتھ اتنی اچھی طرح باتیں کرتی ہے، میرا خیال رکھتی ہے۔ تمہاری طرح کاکٹ کھانے کو نہیں دوڑتی۔ میرا خیال ہے مجھے سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“ وہ اسے کچھ بولنے کے لیے اکسانے لگا۔

”سوچیں ضرور سوچیں۔ میں نے کب روکا ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”یعنی یہ کہ ہر آخر کار مجھے ہی ماننی پڑے گی۔ چلو یونہی سی اپنی بھولی انا کو اونچا کیے بیٹھی رہو۔ میں ہی بارمان لیتا ہوں۔“ وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتا ہوا بولا۔

”تو بات یہ ہے فاطمہ بی بی! کہ میرے ماں باپ یا کوئی اور رشتے دار تو ہے نہیں۔ اس لیے اپنا رشتہ لے کر میں خود ہی آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں۔ مجھے شرف قبولیت بخش کر میری عزت افزائی فرما دیجئے۔ دیکھیے میں ایک خوب رو لائق فائق اور نیک دل جوان ہوں۔ مجھ سے شادی کر کے آپ یقیناً بہت خوش رہیں گی۔“

وہ اس کی بات پر کھٹکھٹا کر ہنس پڑی تھی۔ اسے لگا کہ کتنی مدت بعد اپنے دل کی مکمل ٹماری کے ساتھ ہنس رہی ہے۔ سچی اور خالص ہنسی۔ وہ بڑی توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

کرنے لگا۔

”ہاں ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”اوہ میرے اللہ! اب کیا بات رہ گئی؟“ وہ اپنے خیال سے تمام شکایتیں دور کر چکا تھا۔

”اس کو اپنے آفس سے نکال دیں۔“

وہ اپنے دل کی خواہش کا اظہار برملا کر رہی تھی۔ اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

”تمہارے کہنے سے نکال دوں گا، ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ اس کی معافی ہو چکی ہے اور اگلے مہینے شادی ہونے والی ہے۔“

”کیا۔۔۔؟“ وہ چیخنی ”اتنی دیر سے مجھے الوہنا رہے تھے۔“

”پہلے سے بتا دیتا تو تمہاری وہ جیلس شکل کسے دیکھ پاتا۔“ وہ اسے بے وقوف بنائے جانے پر کچھ ناراض سی ہو کر بیٹھ گئی۔

”تم آج بھی اتنی ہی بے وقوف ہو جتنی پہلے تھیں۔ میرے کلم کے مرکزی خیال نہ لکھ کر دینے پر ناراض ہونے والی۔ ویسے اب اگر تم کو تو بجائے مرکزی خیال کے میں تمہاری شان میں ایک آدھ بے وزن کلم کی کلم ضرور کہہ سکتا ہوں۔“

وہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پاس رکھی پلیٹ میں سے پرائی کھانے لگی۔ تو وہ ٹوکتے ہوئے بولا۔

”کم از کم منہ ہی دھو کر آ جاؤ۔ تمہاری اس شکل سے اب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

اسے کھانے میں مگن دیکھ کر پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔

”جاؤ، حلیمہ درست کر کے آؤ۔ اتنی خوفناک لگ رہی ہو۔“

”اسی شکل کے پیچھے پورے شہر میں مارے مارے پھر رہے تھے۔“ وہ دروازے کے قریب ہو کر بولی اور بھاگ سے باہر نکل گئی تو پیچھے اس کا جان دار قہقہہ سنائی دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے جس کی آواز سنی وہ چنگا کر

کہہ رہا تھا۔

”فرز میں آؤں کریم رکھی ہے۔ وہ لپکتی آتا۔“

بچن کی طرف جاتے اس کی نظر لاؤنج میں دیوار پر لگی اس تصویر پر پڑی جس میں وہ اماں اور حسن ایک ساتھ کھڑے تھے۔ درمیان میں اماں اپنی پڑوقار شخصیت سمیت مسکراتی ہوئی کھڑی تھیں۔ اور ان کی دائیں جانب وہ اور بائیں جانب حسن کھڑا تھا۔ وہ چلتی ہوئی تصویر کے پاس آکر رک گئی اور بڑی محبت سے اپنی ماں کا نورانی چہرہ دیکھنے لگی۔

”میں خود کو تنہا کچھ کر تقدیر سے شامی اور مستقبل سے ناامید رہا کرتی تھی۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ شاہراہ حیات پر میں تنہا نہیں، وہ قدم سے قدم ملائے میرا ہاتھ تھا۔ ہر لمحہ میرے ساتھ تھا۔ پیاری اماں! آج اگر آپ ہمارے ساتھ ہوتیں تو ہمارے اس فیصلے پر یقیناً آپ بھی بہت خوش ہوتیں۔“

وہ جھلملاتی نگاہوں سے اماں کو دیکھ رہی تھی لیکن یہ آنسو خوشی کے اور تشکر کے تھے۔

شکلفہ محمّد کے مرتبہ کردہ

”خاقان کادستر خوان“ اور ”کون دست خوان“

خوبصورت رنگین تصاویر کے ساتھ پہلے بار مجھے

کمانوں کے ممکنہ کتاب

# چائیز کھانے

قیمت 150 روپے

ڈاکٹر 16 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار کراچی